

UNIVERSAL
LIBRARY

OU-234218

UNIVERSAL
LIBRARY

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۲۶۹

طریق تسمیہ

برائے علمِ کیمیا

مَجْوَزَہ

چودھری برکت علی بی۔ ایس سی۔ (علیگ)

رکن شعبہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ
فخریہ بنیاد حیدرآباد دکن

عَلَمِ اِسْرَاطِیْنِ عَلٰی سِرِّ کِیْمِیَا

۱۹۱۸ء

عرضِ حقائق

یہ مضمون ایک کمیٹی میں پیش کیا گیا تھا جو زیرِ صدارت جنابِ معلیٰ انقاب نواب عماد الملک بہادر منعقد ہوئی۔ کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ اس مضمون کو جامعہ عثمانیہ کے شعبہ تالیف و ترجمہ کی طرف سے طبع کروا دیا جائے۔

ان اوراق میں اس بات سے بحث کی گئی ہے کہ علمِ کیمیا میں تسمیہ کا طریقہ کیا ہونا چاہئے۔ جو لوگ اس علم کے دقائق اور اس کی مشکلات سے واقف ہیں وہ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کام کیسی کیسی دشواریوں سے بھرا ہوا ہے۔ جہاں تک مجھ سے ہوسکا ہے میں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس مطلب کے لئے ایک ایسا اسلوب تلاش کر لیا جائے جو علمِ کیمیا کے مطالب بیان کرنے کے لئے بہترین اسلوب ثابت ہو۔ اب میرے خیالات کو غور کی نگاہ سے دیکھ لینے کے بعد ارباب بصیرت اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ میں اس تلاش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اور میری تجویزیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے کس حد تک علمی ضروریات کو پورا کر سکتی ہیں۔

میں نے اس مضمون میں اس قسم کی آزادلیوں سے کام لیا ہے جو اصولِ السنہ اور خصوصاً اردو کی فطرت کے

عین مطابق ہیں۔ لیکن اس پر بھی میرے بعض احباب ان آزادیوں کے جواز کے قائل نہیں۔ اس لئے مجھے خوف ہے کہ اردو دان اصحاب کا ایک گروہ میرے خیالات کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھیگا۔ اس گروہ کی خدمت میں یہ بات عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان اوراق میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر غور کرتے وقت اس بات کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہئے کہ جو کچھ لکھ رہا ہوں علوم و فنون کے لئے لکھ رہا ہوں اور جن آزادیوں کا طلبگار ہوں وہ روز مرہ کے مطالب اور شاعرانہ خیالات کے اظہار کے لئے نہیں بلکہ علوم و فنون کے اصطلاحی الفاظ کے لئے درکار ہیں۔ پھر اس بات کا بھی یقین دلادینا چاہتا ہوں کہ یہ آزادیاں اصطلاحات تک ہی محدود رہیں گی اور ان سے صرف ان مقامات پر کام لیا جائیگا جہاں ان کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوگا۔

افسوس ہے کہ اس مضمون میں مجھے بہت سا وقت اس قسم کی بحثوں میں صرف کر دینا پڑا جو حقیقت میں نفسِ فن سے متعلق نہیں۔ یہی وقت اصلی فن پر صرف ہوتا تو فائدہ سے خالی نہ رہتا۔ لیکن کیا کیا جاے۔ میری مجبوریوں کا یہ عالم ہے کہ اردو کی حفاظت کے دعووں سے، حرفِ حرف پر اور اکثر بلاوجہ میرا قلم بکڑ لیا جاتا ہے۔ فقط

برکت علی

فرخندہ بنیاد حیدرآباد۔ دکن - ۱۹ آذر ۱۳۲۵ء مطابق ۲۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نمبرہ وفضل علی رسول اکرم



تسمیہ کی بحث میں الجھنے سے پہلے اس بات کا تصفیہ ضروری ہے کہ اس مطلب کے لئے کونسی زبان اختیار کی جائے۔ ہندوؤں کی خواہش انہیں گھسیٹ کر سنسکرت میں لے گئی ہے۔ اور مسلمانوں کی خواہش غالباً یہ ہوگی کہ اس تمام عمارت کو عربی کے سالہ سے تیار کیا جائے۔ اور لطف یہ کہ جو کچھ کرنا ہے وہ ہندوستان کے لئے کرنا ہے۔ اور ہندوستانیوں کی زبانیں ان دونوں زبانوں سے اتنی آشنا نہیں کہ کیسیا کو کلیتہً ان کے سپرد کر دیا جائے۔ پھر دوسری وقت یہ ہے کہ ان زبانوں کے الفاظ تو ہم لے سکتے ہیں۔

لیکن ان کی صرف و نحو کو اُردو کی صرف و نحو میں داخل نہیں کر سکتے۔ اور جب تک یہ نہ ہو الفاظ کو اس طرح مربوط کر لینا ممکن نہیں کہ اُس سے ایک مربوط اور سلسل فن کی ضروریات پوری ہو جائیں۔

مجھے اس وقت سنسکرت سے بحث نہیں۔ نہ اُس سے اتنا واقف ہوں کہ کیمیا کے لئے اُس کی طاقت کا اندازہ کر سکوں۔ اس کے متعلق صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستانیوں کے لئے یہ زبان بھی اب ایک اجنبی زبان ہے۔ عربی کے بارے میں البتہ زیادہ کھل سکتا ہوں۔ باقی مسلمانوں کی طرح میرے جذبات بھی اسی امر کے متضمنی ہیں کہ عربی کو ترجیح کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ لیکن پھر اس کا کیا علاج ہے کہ زمانہ کی ضروریات ہماری خواہش کی پابند نہیں۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکتا تھا میں نے اس زبان پر بخوبی غور کیا ہے اور تمام نشیب و فراز کو دیکھ لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ عربی میں اتنی وسعت نہیں کہ تنہا ان مشکلات سے عہدہ بر آ ہو سکے۔ میرے مخدوموں کو اس خیال سے رنجیدہ نہ ہونا چاہیے کہ میں عربی کے نقص وسعت کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ آج دنیا میں کوئی ایک زبان بھی ایسی نہیں جو کیمیائی تسمیہ کی ضروریات کو

تنہا پورا کر سکتی ہو۔ خود یورپ ہی کو دیکھ لیجے۔ وہاں کی زبانیں دست اور جامعیت کے اعتبار سے انتہائے کمال پر پہنچی ہوئی ہیں۔ اور اس پر بھی حال یہ ہے کہ کوئی ایک زبان تنہا اس کام کے لئے کافی نہیں۔ پھر ایسے شریف و مفید فن کو جذبات پر قربان کر دینے سے کیا حاصل ؟

میں اس اصول سے بھی واقف ہوں کہ کیمیا کو ایک International (بین الاقوامی) چیز ہونا چاہیے۔ اس بناء پر سب سے پہلے اس امر کا لحاظ ضروری تھا کہ اس فن میں وہی طریق تسمیہ اختیار کیا جائے جو یورپ میں مروج ہے۔ لیکن اس میں چند در چند مشکلات ہیں۔ جن میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہمارا طرزِ تحریر یورپ کے طرزِ تحریر سے جداگانہ ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ یورپ کے الفاظ کو ہم بلا تفسیر اپنے حروف میں لکھ لیں۔ علاوہ بریں یورپ کی زبانیں ہماری زبان سے اس قدر غیر متعلق ہیں کہ ہماری زبان میں ان کے الفاظ کا داخلہ باہین کثرت ممکن نہیں۔ اور اگر ان الفاظ کو بزور داخل کر لیا جائے تو یہ داخلہ ”حلوہ میں ہڈی“ کا داخلہ ہوگا۔ مجبوراً ان خیالات کو ادا کرنے کے لئے اپنی زبان میں سامان پیدا کرنا پڑیگا۔ اور کیمیا کے طریق تسمیہ میں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ وہ ملک جن کی

زبانیں ہماری زبان کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، کم از کم اُن کے ساتھ Internationality کا خیال ملحوظ رہے۔
 کیسا ایک ایسا فن ہے کہ کوئی ملک تنہا اس کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس فن کی زبان میں Internationality کا رنگ نہایت ضروری ہے۔
 ہم اس رنگ کو نظر انداز کر دیں گے تو زمانہ کو اس کا علاج کرنا پڑیگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری کوششوں کا ایک بڑا حصہ بیکار جائیگا اور ہماری ملکی زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ فن کی ترقی بھی سُست رہیگی۔

مذہب اور قومیت کے اعتبار سے ہمارے

International (بین الاقوامی) تعلقات اُن ملکوں سے

ہیں جہاں عربی، فارسی، اور ترکی زبان کا رواج ہے۔ اور قرب

و معاشرت کے اعتبار سے ہمارے International

(بین الاقوامی) تعلقات ہندوؤن کے ساتھ ہیں۔ اور ان

ہی کی زبان، ہماری زبان کا عنصرِ غالب ہے۔ ان حالات

کی موجودگی میں اگر عربی، فارسی، ترکی بولنے والوں کی

رعایت ضروری ہے تو وہ جو شب و روز ہمارے پہلو

میں رہتے ہیں اور روز مرہ کے کاروبار میں ہمارے

ساتھ دوش بدوش چلتے ہیں، اُن کی رعایت

اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ کیمیائی تسمیہ میں ہم

اس رعایت کو ملحوظ نہ رکھینگے تو ہماری اختیار کی ہوئی زبان کبھی مقبول نہیں ہو سکتی۔ زبانیں جسری حکومت کی بندشوں سے آزاد اور اپنے مخصوص دستور کی پابند رہا کرتی ہیں۔ پھر آج ہمارے بازوؤں میں تو اتنا زور بھی نہیں کہ اہل زبان سے جو چاہیں بزور منوالیں۔ علاوہ ہمیں جو کچھ تیار کر رہے ہیں اس میں ہندو اور مسلم کی تخصیص نہیں۔ وہ تو ہندوستان اور اُردو زبان کے لئے ہے۔

اس مضمون کا ایک اور پہلو بھی نگاہ میں رکھنے کے قابل ہے۔ اگر ہم اس بات کا تہیہ کر لیں کہ نفس فن میں خواہ کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو جائے جم عربی ہی کو توڑ مروڑ کر اس فن کی زبان تیار کریں گے تو اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا تہیہ کس کے بھروسے پر ہوگا۔ عربی، بلاشبہ ہماری قومیت کی جان ہے۔ اور اگر زندہ رہنا مقصود ہے تو اس کی ترویج کے لئے ہمیں سر توڑ کوشش کرنا چاہیے۔ لیکن اس وقت جو کام ہمارے پیش نظر ہے اُسے موجودہ عربی پورا نہیں کر سکتی۔ ناپیار تراش خراش سے کام لینا پڑیگا۔ اور اس تراش خراش کا دائرہ بھی نہایت وسیع ہوگا۔ پھر کیا اس بات کا یقین ہے کہ عرب ہمارے ہاتھوں کی ہر تہ کی ہوئی عربی کو مقبول

کر لینے؟ یہ کام حقیقت میں شامیوں اور مصریوں کے کرنے کا تھا۔ لیکن ان دونوں کی پست ہمتی کا یہ عالم ہے کہ شامی ادھر متوجہ ہی نہ ہوئے اور مصریوں کو زمانہ نے کورانہ تقلید پر ڈال دیا۔ مصریوں کی پست ہمتی کا آج یہ حال ہے کہ علمی اصطلاحات کو اندھا دھند معرپ کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور طرفہ یہ کہ جو اصطلاحات پہلے سے موجود ہیں ان کی جستجو کی زحمت بھی گوارا نہیں۔ اور وہ اصطلاحات جو یورپ نے ہمارے ہاں سے لے کر استعمال کر لی ہیں ان کی اصلیت کو بھی تلاش نہیں کرتے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ تسمیہ کے کام سے عربی قطعاً عاجز ہے۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ میں نے اس کو عاجز پایا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی صاحبِ ہمت صرف اسی زبان کے الفاظ اور اسی زبان کی خالص ترکیبوں سے کیمیائی تسمیہ کی پوری عمارت بنا کر رکھ دیں۔ لیکن اس پر یہ ضرور کہونگا کہ اس صورت میں فنِ کیمیا صرف ہندوستانیوں ہی کے لئے نہیں بلکہ خود عربوں کے لئے بھی ایک چستان بن کر رہ جائیگا۔ اور ترقی تو ایک بڑی بات ہے، طلباء کی نگاہیں فن کے موجودات پر بھی حاوی نہ ہو سکیں گی۔ علاوہ بریں ہم ہندوستان کے رہنے والے ہیں اور ہماری

آبادی ہندوستان کی دوسری قوموں کی آبادی میں ملی ہوئی ہے۔ اس صورت میں یہ ممکن نہیں کہ ہم ملک کے اندر ایک اور ملک پیدا کرلیں۔ پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ ہمارے علوم و فنون کی زبان بھی اُن ہی اصولوں کی پابند ہو جو ہماری ملکی زبان کی جان ہیں؟

ہمیں اس بات پر ناز کرنا چاہیئے کہ خوبی قسمت سے کیمیائی تسمیہ کی ضروریات اُردو کی طبیعت کے عین مطابق ہیں۔ اُردو مختلف زبانوں کے ملاپ سے پیدا ہوئی ہے۔ اور یہ ملاپ صرف الفاظ ہی کا ملاپ نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ ملاپ جملوں کی ترکیبوں اور الفاظ کی بناوٹوں تک میں سرایت کر گیا ہے۔ اور کیمیائی تسمیہ میں ان ہی باتوں کی ضرورت ہے۔ اُردو کی بناوٹ میں بھاشا، فارسی اور عربی کا عنصر غالب ہے۔ اور اُردو دانوں کے کان ان تینوں زبانوں کے الفاظ سے بخوبی آشنا ہیں۔ ان وجوہات کی بناء پر کیمیائی تسمیہ میں ان تین زبانوں سے ہم بخوبی کام لے سکتے ہیں۔ اس میں صرف اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ ان زبانوں سے حتی الوسع وہی الفاظ لئے جائیں جن کے مشتقات میں سے کوئی نہ کوئی پہلے سے اُردو میں موجود ہے۔ اس قسم کے الفاظ اُردو نما ہونگے۔ اس لئے اُن کا مفہوم بلا تکلف اُردو دانوں

کی سمجھ میں آجائے گا۔ یہ اصول اختیار کیا جائے گا تو ہمارے
 اختیار کئے ہوئے طریق تسمیہ میں
 International
 رنگ پیدا ہو جائے گا۔ اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ
 نفسِ فن روشن ہو جائے گا۔

میرے بعض مخدوموں کو میری تجویز پر یہ اعتراض
 ہے کہ مختلف زبانوں کے الفاظ کو ترکیب دینا فصحا کی
 شریعت میں جائز نہیں۔ یہ رائے بلاشبہ ادب اور
 تعظیم کی نگاہوں سے دیکھنے کے قابل ہے۔ اور فصحا
 کے سلمات کی خلاف ورزی ایک گناہِ کبیرہ ہے۔ لیکن
 کیا کیا جائے کہ ضرورتوں کی بھرمار نے مجبور کر دیا ہے
 اور اشد ضرورت کے وقت تو دنیا کے مذاہبِ مُردار
 تک کو حلال کر دیتے ہیں۔ پھر زبانِ بیچاری نے کیا
 قصور کیا ہے کہ اُسے اُس کے فطری حقوق سے
 محروم کر دیا جائے؟ ایک اور پہلو بھی لحاظ کے
 قابل ہے۔ ہر زمانہ اور ہر زبان کے فصحا ہمیشہ
 ان ہی وہموں میں مبتلا رہے ہیں کہ زبانیں اُن کے
 مصنوعی اصولوں کی پابند ہو جائیں۔ لیکن وہ کونسی زبان
 ہے جو تغیر سے محفوظ اور ایک حال پر قائم رہتی ہے؟
 زبانِ اظہارِ مافی الضمیر کا آلہ ہے۔ اہل زبان
 اس سے ہمیشہ آزادانہ کام لیتے ہیں۔ یہ کونسی
 عقلمندی ہے کہ اسے وہم کی زنجیروں میں

جگر کر مافی الضمیر کے لئے فتنہ بنا لیا جائے۔ زبانوں میں تو اتنی آزادی ہے کہ ضرورت تو ضرورت بلا ضرورت نئے نئے الفاظ بنتے چلے جاتے ہیں۔ اور فصحا کے علی الرغم بنتے ہیں۔ اور لطف یہ کہ اکثر مختلف زبانوں کے الفاظ کی ترکیب سے بنتے ہیں۔ پھر کچھ زمانہ گزر جانے کے بعد اُن ہی الفاظ کو فصحا کے دارالافتا سے فصاحت کا فتویٰ مل جاتا ہے۔

اپنی اردو ہی کو دیکھ لیجئے۔ کیا آپ قریب المرگ، فوق البھرک، بے دھڑک، دن بدن، نورچشمی، قبلہ گاہی، تھانہ دار، جمعدار، برقنداز، چوکی نویس، کاپی نویس، چوکیدار، چوکیداری، چوکیدار، طرفدار، اگالان، پانڈان، پیکدان، چٹھی رسان، چٹھی نویس، دھاری دار، اللہ دیا، اللہ رکھا، کتے خسی، ٹیخانہ، ڈاک خانہ، چنگ (منہ + چنگ)، شیر کوٹ، شیر گڑھ، علیگڑھ، سلیم گڑھ، احمد نگر، عمر کھیر و بیہ وغیرہ کو اس سے خارج کر سکتے ہیں؟ اردو سے اس آزادی کا حق پھین لوگے تو اُس کا ایک زبردست بازو کٹ جائیگا۔

زبانوں میں صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ ان میں جو کچھ داخل کیا جائے وہ اس طح داخل کیا جائے کہ اہل زبان اُس کے مفہوم کو بلا تکلف سمجھ جائیں اور جسے اہل زبان سمجھتے ہوں وہ زبان سے خارج نہیں۔ میں نئے نئے الفاظ، نئی نئی ترکیبیں اور نئے نئے محاورے بنانے کا متمنی نہیں۔ صرف اس بات کا متمنی ہوں کہ مجھے ایک اشد ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اُن فصحا کا تتبع کر لینے کی اجازت دے دی جائے جو بلا ضرورت اور محض تفریح

طبع کے لئے وہم اور رواج کی زنجیروں سے آزاد ہو جاتے ہیں۔
 ملاحظہ ہو۔ - نعمت خانِ عالی کہتا ہے اور بلا ضرورت کہتا ہے :-

غُل مگر بانگِ انا الیاء بگلشن زوہ است
 بر سرِ دارِ خیالِ سرِ منصورِ کغم

خاقانی کا گناہ، نعمت خانِ عالی کے گناہ سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ وہ بھی
 کہتا ہے اور بلا ضرورت کہتا ہے :-

تا مہر تو گشت نور افشاں
 ذوالخورشیدین شد شتاباں

پھر ابو الفضل کی آزادی دیکھو۔ نثر لکھتا ہے اور اُس میں بلا تکلف
 عبد الخواہش کہہ جاتا ہے۔ اکبر نے الہ آباد کو الہ باس
 میں بدل دیا۔ آپ کے بزرگوں نے کھانڈیس کو خاندیس کہا۔
 پھر اکبر نے اپنے بیٹے دانیال کی مناسبت سے داندیس بنا
 دیا۔ - بیدل ”الغوید آفتابِ عالمتاب“ بانہضتا ہے -

زیب النساء اور مہر النساء کی ترکیب پر غور کرو۔ بواہوس اور بوتیار
 کو دیکھو۔ بلکہ بر ملا، بنصب، بدقسمت، وحشلکہ، عشرتکہ، مریم کدہ، یوسف کدہ،
 کس طرح بن گئے؟ قیام گاہ، سجدہ گاہ، جملہ گاہ، وغیرہ۔ جلال آباد، حسن آباد،
 وسعت آباد، یوسف زار، شعلہ زار، وغیرہ وغیرہ نے کس طرح رواج پایا؟ سیلاب،
 شمدان، قلعدار، قہرمان، طاقدیس، وغیرہ کے رواج کو کس شریعت نے جواز کا
 فتویٰ دیا؟ واقعہ یہ ہے کہ آج فارسی سے اس آزادی کا حق چھین لیا جائے

تو فارسی زبان کو اقلّٰ تین چوتھائی تک کاٹ کر بھینک دینا پڑیگا۔
ملاحظہ فرمائیے۔ غرغنی کہتا ہے اور کس آزادی کے ساتھ کہتا ہے:-

بہ برقعِ میرِ کنعاں کہ بود حسن آباد

بہ جملہ گاہِ زلیخا کہ بود یوسف زار

اورنگِ زیبی زمانہ کا شاعر بھی دیکھ لیجئے۔ اس کی زبان،
فارسی کے فطری اصولوں سے واقف ہے اور وہ اساتذہ کا تتبع
ہر قدم پر ملحوظ رکھتا ہے:-

ندیمِ کشورے غارتگرِ تاب

بخوبیہائے حسن آبادِ پنجاب

پتھر کہتا ہے اور آزادانہ کہتا ہے:-

عزیز آں شعلہ زارِ عشقِ خوبان

کفِ خاکستری بر شکلِ انسان

اور ملاحظہ فرمائیے:-

زخہر آرائیِ دانش بروں شد

امیرِ وسعت آبادِ جنوں شد

پتھر شاعر کی اس آزادی پر تو ہزار فصاحت کو قربان کر دینا چاہیے۔
دیکھو اس آزادی نے جو لطف پیدا کر دیا ہے وہ اس کے بغیر ممکن نہیں۔

ملاحظہ فرمائیے
مضمون سالانہ کی دینی ملاحظہ فرمائیے
مضمون سالانہ کی دینی ملاحظہ فرمائیے
مضمون سالانہ کی دینی ملاحظہ فرمائیے

گو اے بے سبب سوزِ این چه رنگِ است
مسلمانی است یا کارِ فرنگِ است

شیخ شیرازی فرماتے ہیں :-

نمے بینی کہ گاوسے در علفزار

بیالاید ہمہ گاوایں ده را ۹

اور اس فزخندہ بنیاد حیدرآباد میں تو یار الدولہ اور

افسر الملک وغیرہ تک کی ترکیبیں نکالی ترکیبیں ہیں۔

پھر وہ بھی ہیں جو حسب فرمودے گزر کر حسب القرمود

پر پہنچ جاتے ہیں۔ حضرت نظام الدین امیر خسرو کا ترک اللہ

نام رکھ دیتے ہیں۔ اور کوئی ان آزاد مردوں کا ہاتھ پکڑ کر یہ نہیں

کہتا کہ ایسے جرمِ عظیم کا ارتکاب ! اور وہ بھی بلا ضرورت !

یہ ظاہر ہے کہ جو کچھ ان لوگوں کی زبان سے نکلا ہے،

بلا تکلف نکلا ہے۔ اور اس لئے نکلا ہے کہ سننے والے اسے

بلا تکلف سمجھتے ہیں۔ میں بھی اسی آزادی کا نتیجہ کرنا چاہتا ہوں اور

ضرورتاً کرنا چاہتا ہوں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ کیمیا کی ضروریات

کا خیال رکھنے والوں کو آپ اس آزادی سے محروم کر دیں۔ یہ

لوگ اس آزادی سے محروم رہینگے تو یقیناً آپ کو علم کیمیا سے

محروم رہنا پڑیگا۔ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ اور ممکن ہے کہ میری

کم علمی کا نتیجہ ہو۔ اس لئے میرے مخدوموں کو میری رائے

پر حصر نہ کر لینا چاہیئے۔ کسی صاحب کے ذہن میں اس سے

لگا کر صحیح علی ایوریشن بنا دیتا ہے۔
نہت خاں عالی عربی جاہ میں ترکی کا پیوند

بہتر معجز آجانے تو دنیا یقیناً اس تجویز کو تشکر و اتقان کی نگاہوں سے دیکھیں گی۔

اُردو کی ایک بڑی بد نصیبی یہ ہے کہ اس میں فصاحت و بلاغت کے اصول ابھی منضبط نہیں ہو سکے۔ ہمارے فصحا عربی میں اس فن کو حاصل کرتے ہیں اور اردو پر اس کے احکام جاری کرتے ہیں۔ پھر دوسری خرابی یہ ہے کہ اُردو کی صرف و نحو کے قواعد بھی ابھی کما حقہ مرتب نہیں ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اہل علم کے ایک گروہ نے اس زبان کی صرف و نحو کو کھینچ تان کر عربی کی صرف و نحو کے قواعد کا پابند کر دیا ہے۔ اور دوسرا گروہ اس میں ہندی بھاشا کا عنصر غالب دیکھ کر اس کی صرف و نحو کو ہندی بھاشا کی صرف و نحو بنا دینا چاہتا ہے۔ لیکن میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ یہ دونوں راہیں صراطِ مستقیم سے الگ جا پڑی ہیں۔ جب کوئی صاحبِ ہمت اس فن کی تکمیل پر آمادہ ہوگا تو اس کے سوائے اُسے کوئی چارہ کار نظر نہ آئیگا کہ جس طرح اُردو مختلف زبانوں کے اختلاط سے پیدا ہوئی ہے اُسی طرح اس کی صرف و نحو کے قواعد بھی ان زبانوں کی صرف و نحو کے اختلاط سے تیار کرنا چاہئیں جو اُردو کے اجزائے اعظم ہیں۔ اور اگر یہ بات ملحوظ نہ ہوگی تو اُردو کے سمجھنے اور رواج دینے کے لئے کم از کم ہندی، فارسی، اور عربی تینوں زبانوں کی صرف و نحو کا جاننا لازم ہو جائیگا۔ اور یہ ایک ایسی ہم ہے جو ابتدا میں تو آسان نظر آسکتی ہے۔ لیکن آخر میں جب اُردو، علوم و فنون کا مخزن بن جائیگی تو یہی آسان سی

ہم اس قدر صعب ہو جائیگی کہ اُس سے عہدہ برآ ہونا سخت مشکل ہوگا۔
اُردو کی اصلی صرف و نحو کے نہ جاننے سے ہمارے فصحا

عجیب عجیب دہموں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ان ہی دہموں میں
سب سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ اُن کی شریعت میں عربی، فارسی، ترکی
اور عبرانی کے الفاظ کو باہم ترکیب دے کر بیان کے لئے نئے
نئے اسلوب پیدا کر لینا تو عین جائز ہے لیکن ہندی کے الفاظ
کو ان زبانوں کے الفاظ سے ملا دینا کفر سے شاید کچھ ہی کم
ہوگا۔ اور طرفہ یہ کہ اس گروہ کے سامنے جب وہ الفاظ آتے
ہیں جو اُن کے خلاف مرضی بنے ہیں، لیکن چونکہ اُردو کے
عین اصولِ فطرت کے مطابق بنے ہیں اس لئے اہل زبان
کے یہاں عام رائج ہیں، تو انہیں غیر فصیح کہہ کر رد کر دیتے
ہیں۔ بھکر اُن کی مخالفت کی جاتی ہے تو اُن کی معراجِ فصاحت
یہ ہے کہ شعرائے اُردو کے کلام سے سند طلب کرتے ہیں۔

لیکن میرے مخدوموں کو اس مصنوعی فصاحت کے نام سے مرعوب
نہ ہو جانا چاہیے۔ ہمارے شعرا میں جنہیں استادِی کا رتبہ حاصل ہے
وہ اہل زبان بھی تھے، محاورہ دان بھی تھے اور اس اعتبار سے
بلاشبہ تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں۔ لیکن ذرا اس بات پر تو غور
فرمائیے کہ ان میں کتنے ہیں وہ لوگ جنہیں ہم زبان دان
کہہ سکتے ہیں؟

ہمارے شعرا اور شعرا کے کلام کو زبان کے اعتبار سے
وحیِ آسمانی سمجھنے والے فصحا نے اُردو کے پاؤں میں جو زنجیریں

ڈال رکھی ہیں اُن میں سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ خوفناک یہ ہے کہ دہلی اور لکھنؤ والوں کی زبان سے جو کچھ نکلے وہ اُردو کے لئے نوشتہ تقدیر ہے۔ اس کی خلاف ورزی کا ارتکاب کرنے والوں کی زبان کاٹ لی جاتی ہے۔ لیکن اس مرض کا علاج بتانے والا کوئی نہیں کہ جن خیالات کو دہلی اور لکھنؤ والوں نے آج تک ادا نہیں کیا اور جو باتیں ہمارے شعرا کے تخیل سے بالاتر ہیں اُن کو ادا کرنے کے لئے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ اُردو کو دہلی اور لکھنؤ کے ساتھ شرفِ اختصاص ہے اور جو الفاظ اور محاورے دہلی اور لکھنؤ میں رائج ہیں اُنہیں قابلِ ترجیح تصور نہ کرنا نادانی ہے۔ لیکن پھر وہ چیزیں جن کے ادا کرنے سے دہلی اور لکھنؤ کی زبان قاصر ہے اُن کے لئے دہلی اور لکھنؤ کے باہر اسلوبِ بیان تلاش نہ کرنا اور خواہ مخواہ دہلی اور لکھنؤ کی زبان کو توڑ مروڑ کر بیان کے لئے لے لے اور بے ڈھنگے پیرائے پیدا کرنا بھی عقلمندی نہیں۔ جب تک اُردو پر شعرا کا قبضہ تھا اور شعرا کے تخیل پر انسانی زندگی کا ایک ہی شعبہ مسلط رہتا تھا اُس وقت تک زبان میں یہ التزام بخوبی چل سکتا تھا۔ لیکن ہمیں اب اُردو میں انسانی زندگی اور انسانی تخیل کے ہر شعبہ سے بحث کرنا ہے اور اُن خیالات کو اُردو کا جامہ پہنانا ہے جو آپ کے فصحا کے تخیل سے بالاتر ہیں۔ پھر خود غور فرمائیے کہ اس بے کار اور نہ چل سکنے والے التزام کا سررشتہ ہاتھ میں رکھ کر ہم اس مہم سے کس حد تک عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

یہ بحث بہت دقیق ہے اور مجھے خوف ہے کہ میرے مخدوموں کے دل میں کسی قسم کی غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے۔ اس لئے اپنے بیان کو ذرا زیادہ واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کی زبان کو جو ہم اُردو کی فصاحت کا موقوف علیہ قرار دیتے ہیں یہ حقیقت میں ہماری ہٹ دھرمی ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کی چار دیواری کے اندر تو ہندوستانی زندگی کے بھی تمام شعبے موجود نہیں۔ پھر ان شعبوں کے لئے جو الفاظ اور محاورے درکار ہیں وہ دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں کہاں سے تلاش کئے جائینگے۔ مثلاً میرے مخدوموں میں کتنے ہیں وہ صاحب جو مجھے یہ بتا سکتے ہیں کہ ہمارے ملک میں کسان کو جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے ان کے لئے دہلی اور لکھنؤ کی ٹکسالی اُردو میں کیا نام ہیں اور اپنے روز مرہ کے کاروبار میں ہندوستانی کسان کو جو مطالب ادا کرنا پڑتے ہیں انہیں دہلی اور لکھنؤ کی مخصوص زبان میں کس طرح ادا کیا جائیگا۔ اگر آپ اُردو کو صرف دہلی اور لکھنؤ ہی کی زبان سمجھتے ہیں اور ہر قسم کے انسانی تخیل کو اسی تخیل میں محصور کر دینا چاہتے ہیں جو ہمارے گزشتہ شعرا کا مخصوص تخیل ہے تو پھر آج ہی کمر کھول دینا چاہیے۔ اور وہ ہم جو آج ہمارے پیش نظر ہے اس کو سر کر لینے کی کوئی امید نہ رکھنا چاہیے۔ یہ مضمون نہایت تفصیل طلب ہے اور مجھے اس سے جلد گزر جانا ہے۔ اس لئے تفصیل کو اپنے مخدوموں کے

تخیل پر چھوڑ دیتا ہوں اور خود صرف اس التجا پر اکتفا کرتا ہوں کہ اس تنگ نگہی کو اُن شعرا اور اُن فصحا کے لئے چھوڑ دیجئے جو اپنے تخیل کو صرف زلف و گیسو کے بیچوں کا پابند رکھنا چاہتے ہیں اور آپ علوم و فنون کے حال پر رحم فرما کر اپنے اصولِ فصاحت کے دامن کو کم از کم اتنا وسیع کر دیجئے کہ اُردو میں ان چیزوں کے بلا تکلف سما جانے کے لئے وسعت پیدا ہو جائے۔

بہم اس بات پر بھی غور فرمائیے کہ انسانی تخیل جسے

صانعِ فطرت نے بڑھنے اور پھیلنے کے لئے پیدا کیا ہے آپ اُسے زبان کا تابع کر دینا چاہتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ زبان کو تخیل کی تابع ہونا چاہئے۔ ورنہ تخیل میں وسعت کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کا تخیل محض مقامی تخیل ہے۔ اس لئے وہ خود اور اُس کے اظہار کے لئے جو زبان موجود ہے دونوں نہایت محدود ہیں۔ ہم اس محدود تخیل اور محدود زبان کے پابند رہینگے تو علوم و فنون کا حصول ایک امرِ محال ہو جائیگا۔ اب وہ زمانہ گزر چکا ہے جب اُردو کو آپ صرف دہلی اور لکھنؤ کی زبان کہا کرتے تھے۔ اب تو یہ زبان ایک وسیع ملک کی زبان ہے۔ اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ اُردو کی اس حیثیت میں فرق نہ آنے پائے تو آپ کا فرض ہے کہ ملک کے طبعی تخیل اور زبان کی فطری ضرورت کا لحاظ رکھیں۔ اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو اس مقام پر یہ بات

بھی جتا دینا چاہتا ہوں کہ میری ان التجاؤں کا قبول کر لینا آپ کے قبضہ اقتدار میں ہے لیکن ان کو ہمیشہ کے لئے رد کر دینا آپ کے اختیار میں نہیں۔ اگر آج رد کر دیئے تو کل زمانہ آپ سے بزور منوالیگا۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک وسیع ملک جس کے فرزندوں کے دل نئی نئی آرزوؤں اور نئی نئی امنگوں سے بھرے ہوئے ہیں اُس کا تخیل صرف ان دو شہروں کے مخصوص تخیل کا حلقہ بگوش ہو جائے۔ لامحالہ آپ ہی کو زمانہ کے تخیل کا تابع ہو جانا پڑیگا۔ پھر جس بڑھتے ہوئے سیلاب اور اُٹھتے ہوئے طوفان کے سامنے کل سر تسلیم خم کر دینا پڑیگا اُس کے لئے کیوں آج ہی رستہ خالی نہ کر دیا جائے؟ علاوہ بریں دہلی اور لکھنؤ کی زبان اور دہلی اور لکھنؤ والوں کی خصوصیات کے لئے جو چیزیں وجوہ ترجیح تھیں زمانہ کی نیرنگیوں نے اُن کا نشان تک مٹا دیا ہے۔ پھر خالی نام کی پرستش سے کیا حاصل!! اس اجالی سی تمہید کے بعد اب اصلی مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

کیمیائی تسمیہ میں سب سے پہلے عناصر کے نام آتے ہیں۔ اور ان ناموں کا ایک حد تک فیصلہ ہو چکا ہے۔ عناصر کے تسمیہ میں جو اصول اختیار کئے گئے ہیں اُن کی بحث اس مضمون سے غیر متعلق ہے۔ اس لئے اُسے فی الحال نظر انداز کر دیتا ہوں۔ اور مرکبات کے تسمیہ سے بحث کرتا ہوں۔ تسمیہ کا یہ حصہ نہایت اہم ہے۔ اور حقیقت میں یہی وہ چیز ہے

جس پر فنِ کیمیا کی بناء ہے۔ اس کا خاطر خواہ فیصلہ ہو جائے تو پھر سارے کا سارا فن بلا تکلف ہماری زبان میں منتقل ہو جائیگا۔ اس وقت ہمیں ”فصاحت“ کی ضرورت نہیں۔ ضرورت ہے تو اس بات کی ہے کہ نفسِ فن کو کوئی صدمہ نہ پہنچے اور اُس کے مطالب اس طرح ہماری زبان میں آجائیں کہ طالبِ علم اس فن کی زبان کو بلا تکلف سمجھیں۔ اس مطلب کے لئے ہمارے سامنے دو رستے ہیں:—

ایک یہ کہ یورپ میں جو تسمیہ کا طریق مروج ہے اُسے سامنے رکھ کر مختلف چیزوں کے لئے مختلف علامتیں مقرر کر لی جائیں۔ پھر اپنی دنیا سے یہ کہہ دیا جائے کہ جب ہم فلاں لفظ بولینگے تو اس سے فلاں معنی مراد ہونگے۔ جہاں تک محض تسمیہ کا تعلق ہے یہ رستہ نہایت سہل ہے۔ لیکن یہ سہولت صرف نام رکھنے والوں کے لئے ہوگی۔ ان ناموں کو استعمال کرنے والے چند در چند مشکلات میں پھنس جائینگے۔ یہ ظاہر ہے کہ تسمیہ کا یہ طریقہ کوئی علمی طریقہ نہیں۔ اسے غور سے دیکھئے تو یہ وہی طریقہ ہے جس سے انسان غیر مربوط ہستیوں کے تسمیہ میں کام لیتا ہے۔ ہمارے سامنے چند چیزیں رکھی رہی اور ان کی سرشت و نوعیت وغیرہ کے تعلقات کا لحاظ نہ ہو تو اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی چیزوں کے جو نام رکھ دیئے جائینگے وہی بخوبی کام دے جائینگے۔ لیکن کیمیا کی حالت اس سے جداگانہ ہے۔ اس میں ہمیں بات سے بات پیدا کرنا ہے

اور چیز سے چیز بناتے جانا ہے۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ اس میں تسمیہ کے لئے وہ اسلوب اختیار کریں جس سے فن بلا طلباء کے قابو میں آجائے۔ یہ نہ ہونا چاہیے کہ آج ہم صرف اپنی مشکلات کا لحاظ رکھیں اور اپنے لئے آسانی کی راہیں تلاش کریں۔ ہماری مشکلات صرف چند روز کی مشکلات ہیں۔ اور ہمارے رکھے ہوئے ناموں کو استعمال کرنے والوں کی مشکلات ہمیشہ کی مشکلات ہوں گی۔ اس لئے ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ ہم خود مشکلات کو برداشت کریں اور طلباء کے لئے آسانی کی راہیں پیدا کریں۔ کیمیائی تسمیہ میں یہ اناپ شناپ نام رکھنے کا طریقہ اختیار کر لیا جائیگا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ طلباء ایک خوفناک دلدل میں پھنس کر رہ جائیں گے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے اس سے پہلے اردو زبان میں فن کیمیا کے متعلق ایک کتاب لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر محمد شائق صاحب کی تالیف ہے۔ اس کتاب کو بالائینہا دیکھنے کا مجھے موقعہ نہیں ملا۔ موقعہ ملتا تو شاید اس سے کوئی پتہ کی بات بھی معلوم ہو جاتی۔ صرف چند منٹ کے لئے دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ اور اس میں صرف یہ دیکھ سکا ہوں کہ تسمیہ کا کیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

اس فن پر ایک چھوٹا سا رسالہ مولوی محمد علی صاحب ابوالعلا حیدر آبادی نے بھی لکھا ہے۔ یہ رسالہ فارسی زبان میں ہے۔ اور میں نے اپنے مخدوم جناب نواب حیدر یار جنگ بہادر

کی عنایت سے دیکھ لیا ہے۔ اس میں مرکبات کے تسمیہ کی بحث نہیں۔ صرف چند اصطلاحوں کی تشریح کی ہے اور اس کے بعد چند عناصر کے عجیب و غریب نام رکھ کر رسالہ کو ختم کر دیا ہے۔ ڈاکٹر محمد شائق صاحب نے مضمون کو مقابلتہ ذرا زیادہ وسعت دی ہے۔ لیکن اُن کی کتاب بھی ایک ابتدائی کتاب ہے۔ اور اب سے تیس چالیس سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ اس میں تسمیہ کا وہی طریق اختیار کیا گیا ہے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ اور اس سے بھی مؤلف نے پورا فائدہ نہیں اُٹھایا۔ چنانچہ ابتدائی ناموں کو اتنا پھیلا دیا ہے کہ اُن میں آد زیادہ بھیلنے کی گنجائش نہیں رہی۔ اور یہ بات کیمیا کے لئے نہایت مضر ہے۔

ڈاکٹر محمد شائق صاحب کی کوشش بلاشبہ قدر کے قابل ہے۔ لیکن اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ صاحب موصوف کا دائرہ عمل بہت تنگ تھا۔ اس لئے وہ پورے فن کی ضروریات کو نگاہ میں نہیں رکھ سکے۔ علاوہ بریں اس کتاب کے زمانہ تالیف میں کیمیا کا وہ حصہ جو تسمیہ کی مشکلات سے بھرا ہوا ہے اور جس نے فن کو ایک مریوط اور مسلسل فن بنا دیا ہے غالباً صاحب موصوف کی نگاہ میں نہ تھا۔ یہ حصہ اُن کی نگاہ میں ہوتا تو ضرور تھا کہ تسمیہ کے لئے کوئی بہتر اسلوب تلاش کرتے یا جو کچھ لکھا ہے اُس کا بھی ارادہ نہ فرماتے۔

یہ قاعدہ کی بات ہے کہ گزرا ہوا زمانہ عموماً استحسان

کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اور گزرے ہوئے اربابِ قلم اکثر اُستاد ہو جاتے ہیں۔ میرے بعض مخدوموں کا ارادہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے بنائے ہوئے طریقِ تسمیہ کو اختیار کر لیا جائے۔ اُن کی خدمت میں میری مؤدبانہ گزارش ہے کہ ہمارے سامنے آج پورا فن موجود ہے۔ اور ہماری ذمہ داری چند اوراق کے رسالہ پر ختم نہیں ہو جاتی۔ ہم پورے فن کو رواج دینا چاہتے ہیں۔ اور اس بات کے طالب ہیں کہ سارے کا سارا فن ہماری زبان میں منتقل ہو جائے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کے تجویز کئے ہوئے طریقِ تسمیہ کو ذرا سوچ سمجھ کر اختیار کرنا چاہئے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ ڈاکٹر محمد شائق صاحب کی کتاب ایک ابتدائی کتاب ہے۔ اور اُن کا اختیار کیا ہوا طریقِ تسمیہ پورے فن پر حاوی نہیں۔ میرے بعض مخدوموں کی رائے ہے کہ یہی طریقہ اختیار کر لیا جائے۔ اور اس میں جو کمی رہ گئی ہے اُسے اُن ہی اصولوں سے کام لے کر پورا کیا جائے جو صاحبِ موصوف کے متبع سے وضع ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا اصول یہ ہے کہ اُنہوں نے فارسی کے اسموں کے ساتھ چند غیر الفاظِ افعال کو ترکیب دے کر اسمِ فاعل اور اسمِ مفعول بنائے ہیں یا اُن الفاظ اور علامات سے کام لیا ہے جو نسبت اور صفت کے لئے مخصوص ہیں۔ اور میرے مخدوم ہندی اور فارسی میں اس قسم کے الفاظ اور علامات کا ذخیرہ دیکھ کر خوش ہیں کہ یہ اصول بخوبی کام دے جائیگا۔ یہ رائے نہایت

عمدہ اور وقعت کے قابل ہے۔ لیکن طبایع عالیہ پر شاق نہ گزریں تو اس کے متعلق اتنی بات ضرور عرض کرونگا کہ اس کی عمدگی صرف دیکھنے کے لئے ہے۔ برتنے کے لئے نہیں۔ یہ اصول کہاں تک کام دے سکتا ہے؟ اور اس پر کار بند ہو جانے کے بعد فنِ کیمیا کہاں تک کیمیا رہ جائیگا؟ اس کے متعلق اپنے خیالات ذرا آگے چل کر عرض کرونگا۔ یہاں صرف اس بات کی طرف اشارہ کر دینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ فنِ کیمیا کے مطالب سے واقف نہیں وہ اسی طریقہ کو ترجیح کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی اور رستہ انہیں نظر بھی نہیں آسکتا۔

دوسرا رستہ یہ ہے کہ تمام فن کو سامنے رکھ کر اس پر مجتہدانہ نگاہ ڈالی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ہماری زبان میں وہ کونسا بہترین اسلوب ہے جسے اختیار کر لینے سے فن کی مشکلات حل ہو جائیں گی۔ اور جس طرح اس فن میں مرکب سے مرکب بنتا چلا جاتا ہے اسی طرح نام سے نام پیدا ہوتا جائیگا۔ میرے خیال میں یہی وہ رستہ ہے جسے اربابِ فنِ استحسان کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ کیمیا میں جن چیزوں سے بحث ہوتی ہے وہ غیر مربوط چیزیں نہیں۔ ان کی تو یہ حالت ہے کہ ایک ایک چیز پر کیمیا کی عظیم الشان عارت کھڑی ہوتی جاتی ہے۔ پھر کیا اس بات کی ضرورت نہیں کہ طریقِ تسمیہ میں بھی یہی خوبی موجود ہو؟ یہ خوبی موجود نہ ہوگی تو ہمارے اختیار کئے

ہوئے طریقِ تسمیہ سے فن کی ضروریات پوری نہ ہو سکیں گی۔ اور ضروریات پوری نہ ہونگی تو بھر وہ فن ہی کیا ہوگا۔

یورپ میں جو طریقِ تسمیہ مروج ہے اُس کے متعلق یہ بات نگاہ میں رکھنے کے قابل ہے کہ وہ فن کے ساتھ ساتھ ارتقاء کے مارج طے کرتا آیا ہے۔ اس لئے اُس میں بعض اس قسم کے نقائص اور اسقام باقی رہ گئے ہیں کہ اب یورپ میں اُن کی اصلاح ممکن نہیں۔ ان نقائص اور اسقام پر اب رواجِ علم کی مہر ہے جس کا توڑنا اربابِ فن کی طاقت سے باہر ہو گیا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ جب کوئی ایسی چیز دریافت ہوتی ہے جس کا نام، تسمیہ کے مروج نظام میں ٹھیک نہیں بیٹھتا تو اہل فن کے لئے ایک مصیبت پیا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ آپ کو یاد ہوگا کہ اس قسم کی مصیبتوں سے بچنے کے لئے یورپ والے کو بار بار انٹرنیشنل کانفرنسیں کرنا پڑتی ہیں۔ ہم آج بنے بنائے فن کو لے رہے ہیں۔ اور اس کے لئے اپنی زبان میں تسمیہ کا ایک جداگانہ طریق اختیار کر رہے ہیں۔ ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھا لینا چاہیے اور وہ طریق اختیار کرنا چاہیے جو حتی الامکان نقائص کے میل سے پاک ہو۔ یہ مشکل اس طرح بخوبی رفع ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے تسمیہ کی بنا Radicals کے ناموں پر رکھیں۔ اور Radicals کے تسمیہ میں اس بات کا التزام رہے کہ اُن کے نام بلا تکلف اُن کی ترکیب پر دلالت کریں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ رستہ پہلے رستے کے مقابل میں نہایت کٹھن ہے۔

اور اس رستے پر چل کر منزلِ مقصود پر پہنچ جانا بڑی جانکاہی کا کام ہے۔ لیکن ان مشکلات کی پرواہ نہ کرنا چاہیے۔ جب یہ منزل طے ہو جائیگی تو ہماری کوششوں کا حال ایسا شاندار ہوگا کہ رستے کی تمام کلفتوں کو دور کر دیگا۔ میں اس مضمون کے متعلق جو کچھ عرض کرونگا اُس میں جہاں تک میری طاقت میں ہے یہی سہولت ملاحظہ ہوگا۔

تسمیہ میں تین باتوں کا لحاظ نہایت ضروری ہے۔ اور یہی تین باتیں حقیقت میں کیمیائی تسمیہ کی اصل اصول ہیں:—

- ۱۔ اسم سے اُس کا مسمیٰ معین ہو جائے۔
- ۲۔ اسم اپنے مسمیٰ کی کیمیائی ترکیب پر دلالت کرے۔ اور بلا تکلف دلالت کرے۔

۳۔ نام حتی الامکان، اناپ شناپ اختیار کئے ہوئے Conventions کے میل سے پاک ہو۔

ہمارے اختیار کئے ہوئے طریق تسمیہ میں ان تین باتوں کا انتظام ہو جائے تو وہ بلاشبہ ایک علمی چیز بن جائیگا۔ اور اگر ان باتوں کا انتظام نہ ہوگا تو وہ محض لاجل ہے۔ اب جو کچھ مجھ سے ہو سکا ہے اُسے آپ کی خدمت میں اس غدر کے ساتھ پیش کرتا ہوں کہ یہ کام حقیقت

میں میری طاقت سے بہت زیادہ ہے۔ اس کام کی عظمت، اہمیت اور مشکلات کو دیکھ کر میرا تو دل دہل جاتا ہے۔ اتنی سی جرات بھی محض اس لئے ہو گئی ہے کہ اس کام کو میرے فرائض منصبی میں داخل کر دیا گیا ہے۔ اب آپ سے میری مؤدبانہ التجا ہے کہ اس تجویز کو ازراہِ کرم، بزرگانہ نگاہ سے ملاحظہ فرمائیے اور فنِ کیمیا کی ضروریات کو نگاہ میں رکھ کر اس بات کو دیکھ لیجئے کہ میری تجویز کیمیائی تسمیہ کی شرائط کو کس حد تک پورا کر سکتی ہے۔

کام کی کثرت اور وقت کی تنگی نے مجھے اتنی فرصت نہیں دی کہ پورا پورا طریقِ تسمیہ تیار کر لیتا۔ صرف اُس حصہ پر اکتفا کرتا ہوں جو Inorganic کیمسٹری کے لئے ضروری ہے۔

اور فی الحال مجھے ضرورت بھی اسی کی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ خیال فرمائیے کہ میں organic کیمسٹری کی ضروریات سے غافل ہوں۔ جہاں تک میری طاقت میں تھا میں نے اپنی تجویز میں organic کیمسٹری کی پوری رعایت رکھ لی ہے۔ اور سچ پوچھو تو یہ تمام مصیبتیں حقیقت میں اسی شعبہ کے لئے ہیں۔

میں نے عرض کیا ہے کہ تسمیہ کی بنا ہم Radicals کے ناموں پر رکھینگے۔ اور اس بات کا التزام ریگاکہ Radicals کے نام حتی الامکان اُن کی کیمیائی ترکیب پر دلالت کریں۔ اس اصول کو نگاہ میں رکھ کر سب سے پہلے اُن مرکبات کو لینا چاہیئے، جن کی ترکیب میں صرف دو عنصر داخل ہیں۔ اور

یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ اصول کس خوبی سے کام دیتا ہے۔
 اس قسم کے مرکبات میں وہ چیزیں بھی شامل
 ہو سکتی ہیں، جو ترکیب کے اعتبار سے تو Complex ہیں لیکن
 جب Ionise ہوتی ہیں تو صرف دو Ion دیتی ہیں۔ اس اعتبار
 سے نمک اور ترشے بھی اسی عنوان کی تحت میں آجائینگے۔ اور
 تسمیہ کا یہ طریقہ بخوبی کام دے سکے گا۔

وہ مرکبات جو دو سے زیادہ اشیا پر مشتمل ہوتے
 ہیں اور Ionise نہیں ہوتے ان میں بھی اکثر کا یہ حال ہے
 کہ کیمیائی اصول نگاہ میں ہوں تو وہ بھی آخر تحلیل ہو کر دو
 Radicals پر آجاتے ہیں۔ اور یہ اس طریق تسمیہ کی سہولت
 اور کامیابی کا ایک اور ثبوت ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے
 اکثر نام صرف دُہرے نام ہونگے۔ اور مرکبات کے ناموں کی
 یہی چھوٹی سے چھوٹی شکل ہو سکتی ہے۔

organic کیمسٹری میں یورپ والوں نے ترشوں اور
 نمکوں کے تسمیہ میں کسی حد تک Inorganic کیمسٹری کا تتبع
 کیا ہے۔ چنانچہ اس میں تمام ترشوں کے نام —ic پر
 ختم ہوتے ہیں اور ان کے نمکوں کے لئے —ate کو
 آخری جزء اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ organic
 کیمسٹری میں جن چیزوں کو —ic acids کہا جاتا ہے ان کے
 مقابلہ میں —ous acids نہیں ہیں۔ پھر کوئی وجہ
 نہیں کہ یہاں علامت —ic کو —ous پر اور

علامت ate ————— کو ite ————— پر ترجیح دی جائے۔
 علاوہ بریں تسمیہ کا یہ طریق Organic کیمسٹری میں سخت تکلیف دہ
 ہے۔ اس کے رواج سے کیمیائی تسمیہ کی اصلی غایت فوت
 ہو جاتی ہے۔ اور اسم اپنے مسملی کی ترکیب پر دلالت نہیں کرتا۔
 اس قسم کے وجوہات کی بنا پر یہ طریقہ تقریباً متروک ہو چکا ہے۔
 اور آج organic کیمسٹری میں ان ناموں کا وہی درجہ ہے جو
 Inorganic کیمسٹری میں پُرانے سو قیام ناموں کا ہے۔ چنانچہ
 organic کیمسٹری میں اب تسمیہ کا دستور یہ ہے کہ
 پہلے Radicals کے نام رکھے جاتے ہیں۔ پھر ان کو ملا کر
 مرکبات کے نام بنا لیتے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ مترتب ہوتا
 ہے کہ مرکب کا نام سُنتے ہی اُس کی ترکیب نگاہ کے سامنے
 آ جاتی ہے۔

ہم کیمیائی تسمیہ کی بنا Radicals کے تسمیہ پر رکھینگے
 اور Inorganic کیمسٹری ہی سے اس دستور کی ابتدا کریں گے تو تمام
 فن میں ایک میکرنگی کی کیفیت پیدا ہو جائیگی۔ اور کیمیائی تسمیہ
 کی اصلی غایت فوت نہ ہونے پائیگی۔

کیمیائی تسمیہ میں ایک اور بات بھی ہے جس کا
 خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ سائنس میں دو طرح کے
 تغیروں سے بحث ہوتی ہے۔ ایک وہ جنہیں طبعی تغیر
 کہتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جو کیمیائی تغیر کہلاتے ہیں۔ ان
 دونوں کی نوعیت ایک دوسرے سے جداگانہ ہے۔ اس لئے

ان تغیروں کو بیان کرنے کے لئے اس قسم کے الفاظ سے کام لینا چاہیے کہ ان کا مفہوم، تغیر کی نوعیت پر بخوبی دلالت کر سکتا ہو۔ مثلاً ہم کسی چیز کو زہر آلود یا آب آمود یا زہر آگین یا آب آمیز کہتے ہیں تو ان الفاظ کو سن کر سامع کا ذہن کسی کیمیائی واقعہ کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ اور جو کچھ سمجھ میں آتا ہے وہ یہی ہے کہ متکلم کسی طبعی تغیر یا طبعی تغیر سے پیدا ہونے والی کسی چیز کا نام لے رہا ہے۔ یہ نکتہ ذرا دقیق ہے۔ اسے غور کی نگاہوں سے دیکھنا چاہیے۔ وہ لوگ جو سائنس کے دقائق سے واقف ہیں، جب کسی کی زبان سے یہ جملہ سینگے کہ ”پانی زہر آگین“ ہے تو وہ اس سے یہی سمجھینگے کہ پانی میں زہر ملا ہوا ہے اور اس طرح ملا ہوا ہے کہ ان دونوں کے ملنے سے جو چیز پیدا ہوئی ہے اس میں پانی اور زہر اپنی اپنی جداگانہ ہستی پر قائم ہیں۔ اب الفاظ کی اسی ترکیب کو کیمیا میں استعمال کیا جائے اور اُس کیمیائی مرکب کو جو تانبے اور گندک کی کیمیائی ترکیب سے پیدا ہوتا ہے ”تانبہ گندک آمود“ یا ”تانبہ گندک آلود“ یا ”تانبہ گندک آمیز“ یا ”تانبہ گندک آگین“ کہا جائے تو سننے والا اس سے کیا سمجھگا!! بلاشبہ اُس کا ذہن اسی مفہوم کی طرف منتقل ہوگا کہ جس چیز کا نام لیا گیا ہے وہ گندک اور تانبے پر مشتمل ہے اور اس میں گندک اور تانبے کے ملاپ کا انداز یہ ہے کہ دونوں اپنی اپنی جداگانہ ہستی پر قائم ہیں۔ لیکن کیمیائی تغیر کا مفہوم اس کے

برعکس ہے۔ کیمیا میں کسی تغیر کو کیمیائی تغیر صرف اُس حال میں کہتے ہیں جب تغیر میں حصہ لینے والی چیزیں ایک دوسری کے ساتھ اِس طرح مل جاتی ہیں کہ اِس ملاپ سے جو چیز پیدا ہوتی ہے اُس میں اِن چیزوں کی جداگانہ ہستی باقی نہیں رہتی۔ پھر خود خیال فرمائیے کہ کیمیائی تسمیہ میں اِس قسم کی ترکیبیں کہاں تک کام دے سکتی ہیں۔

میری رائے یہ ہے کہ کیمیائی تسمیہ میں غیر الفاظ سے مدد لینے کی بجائے اُن ہی الفاظ سے کام لینا چاہیے جو عناصر اور Radicals کے ناموں کو تعبیر کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں یا وضع کئے جائینگے۔ اور عناصر کے کیمیائی تعامل سے جو تغیر پیدا ہوتے ہیں اُنہیں تعبیر کرنے کے لئے اِن الفاظ کو افعال کے طور پر استعمال کرنا چاہیے۔ اِس صورت میں وہ التباس جس کی طرف اوپر کی تقریر میں اشارہ کیا گیا ہے بخوبی رفع ہو جائیگا۔ علاوہ بریں اِس طریقہ کو اختیار کر لینے سے ناموں میں اعلیٰ درجہ کی لچک پیدا ہو جائیگی۔ اور نئے نئے خیالات کو ادا کرنے کے لئے ایک عمدہ اسلوب ہاتھ آجائیگا۔ نام زبانوں پر بخوبی رواں ہو سکیں گے۔ اور سب سے بڑی خوبی اِس میں یہ ہوگی کہ ہمارا طریق تسمیہ Conventions کی بھر مار سے بچ جائیگا۔ جن لوگوں نے سائنس کو پڑھا ہے اور پڑھا یا بھی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ Conventions کی بہتات طلباء کے لئے کس قدر ہمت شکن ہے اور اِس سے

کیسے کیسے مضر نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ خود یورپ والوں کو
 اس بات کا اعتراف ہے کہ سائنس میں Conventions
 کی بھرمار طلبا کے حافظہ پر ایک بے جا بار ہے جس نے
 علمی ترقی کی راہوں میں ایک ہیبت ناک روک پیدا
 کر رکھی ہے۔ چنانچہ وہ بھی ان بندشوں سے آزاد ہوجانے
 کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور وہ چیزیں جو عرفِ عام کی زنجیروں
 سے آزاد ہیں ان میں بہت کچھ تراش خراش کرچکے ہیں۔
 مثال کے طور پر organic کیمسٹری کا تسمیہ موجود ہے۔ اس
 فن کی کوئی مستند کتاب اُٹھا کر دیکھ لیجے۔ رواجی تسمیہ
 کے ساتھ ساتھ علمی تسمیہ بھی موجود ہے۔ اور علمائے فن
 کے رُجحانِ طبع کا یہ عالم ہے کہ رواجی تسمیہ کو رواجِ عام کا
 سہارا نہ ہوتا تو اُس کا نام و نشان تک مٹ جاتا۔

اسماء کو افعال کے طور پر استعمال کرنے کی جو میں
 نے تجویز پیش کی ہے وہ ضرور آپ کے کانوں میں کھٹکیگی۔
 اور ممکن ہے کہ بظاہر خلافِ قاعدہ معلوم ہو۔ لیکن صرف اس
 بنا پر اس تجویز کو رد نہ کر دینا چاہیے۔ یہ تجویز عین اصولِ لسنہ
 کے مطابق ہے۔ وہ کونسی زبان ہے جس میں اس ”جرم“ کا
 ارتحباب نہیں ہوتا۔ اپنی اردو ہی کو دیکھ لیجے۔ اس میں
 لکڑی سے لکڑانا، پتھر سے پتھرانا، پانی سے پینانا، مٹھی سے مٹھیانانا،
 ہات سے ہتھیانانا، لٹھ سے لٹھیانا، جوتے سے جوتیانانا، کھاتے سے کھتیانانا،
 دھارتے سے دھارتیانانا بن گیا ہے۔ اور اسی طرح کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔

پھر اس لطف کو ملاحظہ فرمائیے کہ اسمائے صفات بھی اسی لپیٹ میں آگئے ہیں۔ چوڑا سے چوڑانا، لمبا سے لمبانا، دُہرا سے دُہرانا، دوسرا سے دُسرانا، تہرا سے تہرانا، تیسرا سے تِسرانا، اس کی مثالیں ہیں۔ اور اہل زبان کی اس آزادی پر تو قربان ہوجانا چاہیے کہ دولڑا سے دُلڑانا، اور گلڑا سے تلڑانا پر پہنچ گئے ہیں۔ عربی پر غور فرمائیے۔ اُس میں بھی سینکڑوں الفاظ ہیں جو تخرید کی حالت میں اسم یا کچھ اور ہیں۔ اور توڑ مروڑ کر اُن سے افعال کا کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً قوس سے تقوس، نصف سے انصاف و تنصیف۔ اور طرف یہ کہ کشمیر سے تکشمیر (کشمیری بننا) بن گیا ہے۔ اور اب تو oxide سے اکساد اور تاکسد بنا لینے پر بھی کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ فارسی کے دامن میں بھی یہی وسعت موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ زبان کا قانون اجازت نہ دیتا تو یکسو سے یکوئیدن، یکساں سے یکسانیدن، قند سے قانیدن (بمعنی قند صاف کردن) خشک سے خشکیدن اور خشکانیدن، شراب سے شرابیدن اور کباب سے کبابیدن، کیونکر بن جاتا۔ شاعر کہتا ہے:۔

اگر بے تو یکدم شرابیدہ باشم

بہ کا فون ہجرت کبابیدہ باشم

پھر اس آزادی کو دیکھو کہ مکہ سے مکیدن (مکہ جانا) مدینہ سے مدیندن (مدینہ جانا) مکر سے مکریدن۔ طوف سے طوفیدن (طوف کرنا) بنا لیا ہے۔ اور اہل زبان کی یہ شوخ چشمی

لاحظہ ہو کہ عمر سے عمریدین (حضرت عمرؓ کے مرقد کی زیارت کرنا) اور ابابکرؓ سے ابابکریدین (حضرت ابوبکرؓ کے مرقد کی زیارت کرنا) استعمال کر لیا ہے۔ طرزی کہتا ہے :-

مذیدیم پس از مکیدن نہ بس حید و نے مکریدن
مرقد پاک نبی طوفیدیم عمریدیم و ابابکریدیم

ان الفاظ پر غور فرمائیے۔ استعمال ہوئے ہیں اور بلا تکلف استعمال ہوئے ہیں۔ پھر سمجھانے کے لئے نہ حاشیہ کی ضرورت پڑی ہے نہ تفسیر کی۔ سننے والوں نے سنا ہے۔ اور ان کا مفہوم بلا تکلف اُن کی سمجھ میں آ گیا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ایسے ہمہ گیر اصول کو زبان کے قواعد سے خارج کر دیا جائے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ چیزیں سماعی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ذرا اس بات پر بھی خیال فرمائیے کہ زبان میں وہ کونسی چیز ہے جو سماعی نہیں؟ اور وہ کونسی زبان ہے کہ استعمال میں آنے سے پہلے ”فصحاً“ نے صلاح و مشورہ سے اُس کے لئے قوانین و ضوابط بنا دئے تھے؟

ہماری ادبیات میں سماع کی اصطلاح جس طرح رائج ہو گئی ہے وہ ایک ہمل اصطلاح ہے۔ اس کا وہ مفہوم جو ہمارے اساتذہٴ ادب کے ذہن میں قائم ہو گیا ہے میں اُس کا قائل نہیں۔ یہ حقیقت میں ہمارے محققین السنہ کے عجزِ تحقیق کا نتیجہ ہے۔ جب کسی لفظ کے اشتقاق کی تلاش یا صرف و نحو کے کسی غیر معمولی قاعدہ کی جستجو

میں اُن کا قیاس جو خود ناقص ہوتا ہے، کام نہیں دیتا تو وہ اُسے سماعی کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔ اور جس طرح واقعات کے باب میں عوام کا دستور ہے کہ جب کسی واقعہ کا نام رکھ دیا جاتا ہے تو اُن کی تسکین ہو جاتی ہے اور اُن کے نزدیک واقعہ کے اسباب و علل کی تلاش ضروری نہیں رہتی، اُسی طرح کسی لفظ کو سماعی کہہ دینا بھی اُن کی نگاہ میں تحقیق کی آخری سرحد بن جاتا ہے۔ چنانچہ عربی، فارسی، وغیرہ کے وہ الفاظ جن کے متعلق ہمارے فصحاء نے کسی گزرے ہوئے زمانہ میں سماع کا فتویٰ دے دیا تھا، جب اُن کے مقلدین کی نگاہ میں آتے ہیں تو قیاس کو زیادہ وسعت دینا اور حقیقتِ حال کی تلاش میں مزید تنگ و دو کا ارادہ کرنا اُن کی شریعت میں حرام ہو جاتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اہل زبان کی زبان سے جو کچھ ادا ہوتا ہے اور اُسے اہل زبان سمجھ لیتے ہیں وہ ہمیشہ اصولِ زبان کی تابع اور کسی نہ کسی قاعدہ کی تحت میں ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی وقت وہ قاعدہ عوام کی نگاہ میں قبولِ عام کے پایہ سے گر جائے۔ قبولیت اور عدم قبولیت کے اسباب ہوتے ہیں جو تغیراتِ زمانہ کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ قاعدہ مَر جاتا ہے اور اس قاعدہ کے رو سے بنے ہوئے بعض الفاظ باقی رہ جاتے ہیں۔ لیکن اِس میں شک نہیں کہ ہر زبان پر ہر حال میں اُس کے مخصوص قواعد کی غلڈاری رہتی ہے۔ اِن قواعد کی پابندی

اہل زبان کی فطرت میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور اُن کی طبیعتیں بلا تکلف اور بلا عمد ان قواعد سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ میں وہ الفاظ بھی دکھا سکتا ہوں جو اہل زبان نے ظرافتاً یا تفریحاً پیدا کئے، لیکن اُن کی پیدائش اور بناوٹ چونکہ اصولِ زبان کے عین مطابق تھی اس لئے ظرافت اور تفریح کا پیچھا لا رفتہ رفتہ اُن سے الگ ہوتا گیا اور آخر فصحا نے بھی اُنہیں سندِ اعتبار عطا کر دی۔ پھر اصول السنہ کی بحث میں یہ بات بھی نگاہ میں رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بنی نوع انسان کی آزادی کو حیات و مہمت کے مارج طے کرنا پڑتے ہیں اُسی طرح زبانوں کی آزادی بھی حیات و مہمت کے مارج طے کرتی رہتی ہے۔ آزادی کے فقدان اور ضروریات کی قلت سے تخیل کا دائرہ ہمیشہ تنگ ہو جایا کرتا ہے۔ اور جب تخیل کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے تو مطالب کے ساتھ ساتھ ادائے مطالب کے پیرائے بھی مرجاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میرے مخدوم میری آزادی چھین لینے سے پہلے اس بات پر بھی غور فرمائیں گے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں اُس کی اصلی غایت تو وسیع تخیل ہے۔ اور جب تک ادائے مطالب کے پیرایوں میں وسعت نہ ہوگی تخیل میں وسعت کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ پھر کیا طبعِ سلیم کا تقاضا یہ نہ ہونا چاہیے کہ اشد ضرورت کے وقت جب ہماری مروجہ فصاحت کے پاؤں ننگ ہو جائیں تو مجھے اُن پیرایوں کو جگا لینے کی

اجازت دے دی جائے جو ہمارے اسخطاطِ تخیل اور ہماری
غلامی کا شکار ہو گئے ہیں؟

اعتراض سے پہلے اس بات کو بھی سوچ لینا چاہیے
کہ جن لوگوں کو ہم فصحا کہتے ہیں اور اُن کی تقلید پر مٹ
رہے ہیں اُن کی ضرورتیں کس قسم کی تھیں۔ اور ہماری ضرورتیں
کس قسم کی ہیں۔ اُنہیں صرف چند خیالات کو ادا کرنا تھا
اور وہ خیالات اس طرح کے تھے کہ اُن میں کسی قسم کے
ارتباط کی ضرورت نہیں۔ ہمارے سامنے آج گونا گون خیالات
ہیں جن کے لئے متقدمین کے اختیار کئے ہوئے پیرائے
کفایت نہیں کرتے۔ اور اس پر دوسری مشکل یہ ہے کہ
ان خیالات کو ایک سلسلہ میں مسلسل کرنا ہے۔ ان
مطالب کے لئے تو زبان کے ذرا ذرا سے سہاروں کو بھی
غنیمت سمجھنا چاہیے۔ فصحا کی تعظیم ہمارا فرض ہے۔ لیکن
اس تعظیم کو پرستش کے درجہ تک پہنچا دینا اور فصحا کو اپنی
زبانوں کا مالک سمجھ لینا ٹھیک نہیں۔ اس بوالعجبی کو کون گوارا
کر سکتا ہے کہ ایک بلند پایہ فن کے صن و خوبی کو اُن فصحا
کے خود ساختہ وہوں پر قربان کر دیا جائے جو محاورہ دانی
اور زباندانی کے امتیاز پر بھی قادر نہیں؟ میں آپ صاحبوں کے سامنے
شاگردانہ حیثیت سے پیش ہونے کی بھی قابلیت نہیں رکھتا اور آپ کا درجہ
اتادانہ درجہ ہے۔ آپ اس بات کو مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ ہماری زبان کو
اُن ہی دس بیس خیالات تک محدود نہ ہو جانا چاہیے جو آتش، ناسخ،

میر اور سووا وغیرہ لکھے ہیں۔ ہمیں اُن اصولوں پر عمل کرنا چاہیے جو زبانوں کی بنا ہیں۔ اور جن سے زندہ قوموں کی دُنیا فائدہ اُٹھا رہی ہے۔ اس آزادی کی اجازت نہ ہوگی تو کیسا کو بہ حیثیتِ فن، اُردو میں منتقل کر لینا محال ہو جائیگا۔ فصحا نے جو کچھ اختیار کیا ہے یا چھوڑ دیا ہے وہ کسی شریعت کے فتوے کا نتیجہ نہیں کہ ہم اُس کے پابند ہو جائیں۔ زبان کو صرف ضرورت کی تابع رہنا چاہیے۔ جو چیزیں ہمارے فصحا کے لئے غیر ضروری تھیں، ہمارے لئے وہ آج ضروری ہو گئی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اُن سے فائدہ نہ اُٹھائیں؟ علاوہ بریں جن چیزوں کو اہل زبان بخوبی سمجھ سکتے ہیں اور اُن کے استعمال کی اشد ضرورت ہے "فصاحت" کے دعویداروں کو اُن کے اخراج کا کیا حق ہے؟

اس تقریر کے ضمن میں یہ بات بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ کیسائی تسمیہ کا جو طریق تجویز کر رہا ہوں اُسے یا اُس سے ملتے جلتے کسی طریق کو اختیار کر لیا جائیگا تو جس طرح خود نفسِ فن میں بڑھنے اور پھیلنے کی گنجائش ہے اُسی طرح آپ کے اختیار کئے ہوئے طریقِ تسمیہ میں بھی بڑھنے اور پھیلنے کی گنجائش ہوگی۔ اور آپ کا اختیار کیا ہوا طریقِ تسمیہ ارتقائے فن کا بخوبی ساتھ دیتا جائیگا۔

اس طریق کو آپ رد فرمادیجئے تو اس کے بعد دوسرا طریقہ جو آپ اختیار کر سکتے ہیں وہ وہی طریقہ ہے جس کی طرف

اس سے پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ یعنی اسموں کے ساتھ نسبت اور صفت کی علامتیں لگائی جائیں گی یا ایسی ترکیبوں سے کام لیا جائیگا جو صفت کے لئے مخصوص ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ کس قدر پُرخطر ہوگا۔ اس صورت میں پہلے ہی قہر م پر یہ مصیبت پیش آئیگی کہ طلباء کی عمر کا ایک بڑا حصہ نفسِ فن کو حاصل کرنے کی بجائے Conventions کے رٹنے میں صرف ہو جایا کریگا۔ پھر رٹ لینے کے بعد Conventions کا حافظہ میں جاگزیں رہنا کہاں تک ممکن ہے؟ یہ امر تشریح کا محتاج نہیں۔ علاوہ بریں پورے فن کو نگاہ میں رکھ کر آپ غور فرمائیگی تو آپ کو مان لینا پڑیگا کہ آپ کے پاس اس قسم کی علامتوں اور ترکیبوں کا ذخیرہ اتنا وسیع نہیں کہ ایک بڑھتے ہوئے فن کی ضروریات کے لئے بلا تکلف کافی ہو جائے۔

میرے مخدوم جو اس طریقہ کے طرفدار ہیں وہ غالباً اپنی تجویز کو اس دلفریب خیال کا سہارا دینگے کہ نسبت اور صفت کی علامتوں کے استعمال سے جو الفاظ بنیں گے وہ ہماری "اپنی" زبان کے الفاظ ہوں گے۔ اور اگر کوئی ذرا سی چیز کسی بیگانہ زبان سے لے کر استعمال کر لی جائیگی تو ہمارے بناتے ہوئے الفاظ بیگانہ زبان کے الفاظ ہو جائیں گے۔ لیکن یہ اپنے اور بیگانہ کا امتیاز ذرا غور طلب ہے۔ اس سے جلدی مرعوب نہ ہو جانا چاہیے۔ ایک خیالی "اپنے" کے لئے ایک نہایت شریف اور خانداندار فن کی ضروریات کو نظر انداز کر دینا

قرینِ مصلحت نہیں۔

میرے مخدوموں کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ جن ترکیبوں کے وہ دلدادہ ہیں اُن کے استعمال سے یہی خرابی پیدا نہ ہوگی کہ اُن کا مفہوم طالبانِ فن کو گمراہ کرنے والا اور مصیبت میں ڈال دینے والا ہوگا۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک خرابی یہ بھی ہوگی کہ اکثر الفاظ بلا ضرورت موٹے اور بھاری ہو جائیں گے۔ اور زبانیں ہمیشہ سہولت پسند ہوا کرتی ہیں۔ موٹے موٹے الفاظ اور لمبی لمبی ترکیبوں سے کتابوں کی سجاوٹ ہو سکتی ہے اور ممکن ہے کہ علماء کے دماغ بھی اُن کے متحمل ہو جائیں۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ زبانوں کی سہولت پسندی اس قسم کی چیزوں کو ہمیشہ ٹھکرا دیا کرتی ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے گھروں ہی میں دیکھ لیجئے۔ والدین اپنے بچے کا ایک شاندار لمبا چوڑا نام رکھتے ہیں۔ اور اُسے استعمال نہیں کر سکتے۔ سہولت پسندی کا فطری قانون انہیں مجبور کر دیتا ہے کہ روز مرہ کے استعمال کے لئے ایک اور چھوٹا سا نام تجویز کر لیں۔ اور اگر والدین اس قانون کا تتبع نہیں کرتے تو اُن کے لئے ہمسائے اس مشکل کو حل کر دیتے ہیں۔ آپ جن چیزوں کے نام رکھنا چاہتے ہیں وہ اس قسم کی چیزیں ہیں جو ذہنی نہیں۔ بلکہ خارج میں بھی اپنا وجود رکھتی ہیں۔ اور اگر آپ اپنے ملک اور اپنی قوم کو اس فن سے مستفیض کرنا چاہتے ہیں تو اس بات کا لحاظ نہایت ضروری ہے کہ یہ

چیزیں عنقریب آپ کے اپنے ملک میں تیار کی جائیں گی۔ اور بازاروں میں رکھی جائیں گی۔ پھر ان چیزوں کے ناموں پر آپ ہی کا قبضہ نہ ہوگا بلکہ عوام بھی اس میں برابر کے حصہ دار ہونگے۔ اگر آپ کیمیائی تسمیہ میں اُن فطری اصولوں کا لحاظ نہ رکھیں گے جن پر زبانوں کے بننے اور بڑھنے کی بنا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک طرف تو فن کی ترقی رُک جائیگی۔ اور دوسری طرف یہ مشکل ہوگی کہ وہ لوگ جو فی الواقع اور فطراً ”اہلِ نَسَبان“ ہیں وہ آپ کے رکھے ہوئے نام قبول نہ کریں گے۔ اور اپنے الگ نام تجویز کر لیں گے۔ پھر اس سے جو خلط و التباس پیدا ہوگا اُس کی مضرتوں کو آپ خود مجھ سے بہتر سوچ سکتے ہیں۔

یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہئے کہ آج زبان کی ایک وہی سی حفاظت کی دُھن میں آپ فن کی ضروریات کو نظر انداز کر دینگے تو اس سے یہ نہ خیال فرمائیے کہ آپ کی یہ حفاظت دیر تک قائم رہ سکیگی۔ ملک میں فن کا چرچا ہوگا تو فن کی ضروریات یقیناً آپ کے خیالات پر مقدم ہو جائیں گی۔ اور آپ کی قائم کی ہوئی حدیں خود-خود ٹوٹ جائیں گی۔ پھر تاریخ میں دیکھ لیجئے کہ اس قسم کے واقعات سے کیسے کیسے فتنے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ جب وقت آئیگا تو فن کی ضرورتیں اہل فن کو مجبور کر دینگی کہ آپ کے وضع کئے ہوئے تسمیہ کے مقابلہ میں ایک اور طریقہ وضع کریں۔ اور جب یہ ہوگا تو آپ کے ملک میں

تین گروہ ہو جائینگے۔ ان میں سے دو آج آپ کے سامنے موجود ہیں۔ ایک گروہ کی یہ رائے ہے کہ اصطلاحات کا ترجمہ نہ کرنا چاہیے۔ اور دوسرا گروہ ترجمہ کا حامی ہے۔ اسی طرح آگے چل کر ایک گروہ آپ کے وضع کئے ہوئے تسمیہ کی حمایت کریگا۔ اور دوسرا اس میں تغیر کا طلبگار ہوگا۔ آزادی پر کسی کی حکومت نہیں۔ لوگ اپنی اپنی رائے کے مطابق کتابیں لکھینگے۔ اور اس سے کیمیا کی دنیا میں ایک فتنہ بپا ہو جائیگا۔ مثال ملاحظہ فرمائیجے۔ عربوں نے یونانی علوم و فنون کا ترجمہ کیا تو ابتدا میں اکثر اصطلاحات کو معرب کر لیا۔ پھر انہیں بہت جلد انتباہ ہو گیا۔ اور ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنی زبان میں اصطلاحیں وضع کرنی چاہئیں۔ لیکن رواج حکومت کی زنجیروں سے آزاد ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عربی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ بہت سی معرب اصطلاحات بھی آج تک موجود ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ وہی اصطلاحات جو یونانی زبان میں با معنی تھیں۔ اور اپنے مدلول پر بلا تکلف دلالت کرتی تھیں عربی میں ہل اور محض Conventional ہیں۔

یہ جو طریق تجویز کر رہا ہوں۔ اُس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس میں الفاظ کی ترکیبیں نئی ہیں۔ اور ہمارے ”نصحا“ کا فتویٰ ہے کہ نئی ترکیبوں کا وضع کرنا حرام ہے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے اس مسئلہ پر جہینوں غور کیا ہے۔ اور مجھے اس کے سوا اور کوئی مخلص

نظر نہیں آیا۔ مجبوراً اس فتوے کی خلاف ورزی کا ارتکاب کرتا ہوں۔ اور ”فصحا“ کو رنجیدہ نہ ہونا چاہیے۔

اِس گناہ است کہ در شہرِ شما نیز کنند

خیالات نئے ہیں۔ ان کے لئے اسلوب بیان بھی نیا ہونا چاہیے۔ میرا ذاتی مذہب یہ ہے کہ اصولِ زبان اور ضروریات فن کی خلاف ورزی نہ ہو تو مروج الفاظ اور مروج ترکیبیں بلاشبہ قابلِ ترجیح ہیں۔ اور میں انہیں ہمیشہ ترجیح کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ اِس قسم کے خیالات جو آج ہمیں ادا کرنا ہیں انہیں ہندوستان میں نہ کسی شاعر نے بانڈھا ہے نہ کسی ادیب نے قلم بند کیا ہے۔ نہ وہ دہلی اور کھنڈو کے فصحا کی زبان سے سننے میں آئے ہیں۔ پھر اِس قسم کی مجبوریوں میں اِس کے سوا اور کیا چارہ کار ہے کہ زبانوں کے بننے اور پھیلنے کے فطری اصولوں سے کام لیا جائے؟

یہ مسلم ہے کہ اِس مطلب کے لئے ہمیں بنے بنائے الفاظ نہیں بل سکتے۔ پھر میری ترکیبوں پر یہ اعتراض ہو کہ یہ نئی ترکیبیں ہیں اور نئی ترکیبوں کا وضع کرنا بدعت میں داخل ہے تو دوسری صورت میں جب صفت اور نسبت کی علامات یا اسی طرح کی کسی اور چیز سے کام لیا جائیگا تو کیا ان کے جواز کے لئے کوئی سزا مل سکتی ہے؟ اور اگر یہ نہیں تو ذرا سے وہم کی خاطر مضبوط اور کار آمد بناؤں کو چھوڑ کر ریت کی

بناؤں پر عمارت بنانے کی کیا ضرورت ہے ؟

ان مقدمات کے بعد وہ طریق تسمیہ پیش کرتا ہوں جسے میرے بعض مخدوم پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ میں نے یہاں تک جو کچھ عرض کیا ہے اُس میں میں نے فن کے اصلی دقائق کو عمداً نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ نہ کرتا تو میرا بیان میرے اکثر مخدوموں کے لئے پیستان بن جاتا۔ تاہم جو کچھ عرض کیا گیا ہے اُس سے فن کی بہت سی ضروریات آپ کی نگاہ کے سامنے آگئی ہوں گی۔ اب آپ فیصلہ فرما سکتے ہیں کہ تسمیہ کا یہ طریقہ، فن کی ضروریات کو کہاں تک پورا کر سکتا ہے۔ اور اس کو اختیار کر لینے کے بعد کیمیا کا فن کس حد تک روشن ہو جائیگا۔ مجھے اس بات کا علم نہیں کہ میرے مخدوموں نے کون کون سی علامتیں کن کن چیزوں کے لئے اختیار کی ہیں۔ اس لئے میں اس طریقہ سے مفصل بحث نہیں کر سکتا۔ صرف نمونہ دکھا دیتا ہوں۔ اور اُس کے حسن و قبح کی جانچ پر تال کے لئے غالباً اتنا ہی کافی ہوگا۔ اس طریقہ کی بنا اس بات پر ہے کہ انگریزی ناموں کو سامنے رکھ کر انگریزی علامتوں کے مقابل، مختلف چیزوں کے لئے اناپ شناپ اُردو علامتیں اختیار کر لی جائیں۔ اور اُن کے الگ الگ مفہوم قائم کر دئے جائیں۔ پھر جمہور کے اجتماع اور رواج کی عمومیت سے ہمارے قائم کئے ہوئے مفہوم نمود بخود دنیا کے ذہن نشین ہوتے جائیں گے۔

مثال کے طور پر گندک کے چند مرکبات کے نام ملاحظہ فرمائیے۔
اور انگریزی میں ان کے لئے جو امتیازی علامات مقرر ہیں
ان کو دیکھئے:—

Hydrosulphuric Acid or **Hydrogen Sulphide** ($H_2 S$)

Sulphurous Acid ($H_2 SO_3$)

Sulphuric Acid ($H_2 SO_4$)

Sulphonic Acid ($R \cdot SO_2 \cdot OH$)

Sulphinic Acid ($R \cdot SO \cdot OH$)

Thio Sulphuric Acid ($H_2 S_2 O_5$)

Thionic Acid $S_n \begin{cases} SO_2 \cdot OH \\ SO_2 \cdot OH \end{cases}$

Thionyl Chloride ($SO Cl_2$)

Sulphuryl Chloride ($SO_2 Cl_2$)

یہ چند نام ہیں جن میں گندک کے انگریزی ناموں
کے ساتھ امتیازی علامتیں استعمال کی گئی ہیں۔ اب آپ گندک
کے نام کے ساتھ اپنی اُردو کی ایک ایک علامت لگاتے جاتیے۔
اور دیکھئے اس کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس سے آپ کو یہ بھی معلوم
ہو جائیگا کہ فن حاصل کرنے والوں کے لئے تسمیہ کا یہ طریق زیادہ
سہل اور زیادہ مطلب نیز ہے یا وہ طریق جس میں تسمیہ کی
ابتدا Radicals کے ناموں سے ہوگی۔ چند مثالیں اور
ملاحظہ فرمائیے:—

مثلاً

Copper Sulphide	یا تانبا کبریت وٹ	تانبا گند کیلا
Copper Sulphite	یا تانبا کبریت آگین	تانبا گندک آسا
Copper Sulphate	یا تانبا کبریت آمود	تانبا گندک گون
Copper Sulphonate	یا تانبا کبریت آمیز	تانبا گندک مان
وغیرہ	وغیرہ	وغیرہ

ان الفاظ پر غور کرو۔ یہ کسی فن کے مطالب کو تعبیر کرتے ہیں یا کوئی چیستان بیان ہو رہی ہے!! کیمیا کے لئے یہ الفاظ بالکل بے معنی ہیں۔ ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں کہ کیمیا کی زبان میں کام دے سکتا ہو۔ ہاں توڑ مروڑ کر کچھ مفہوم پہنا دیا جائے تو ممکن ہے کہ کسی طبعی واقعہ کی تعبیر ہو سکیں۔ لیکن طبعی واقعات اور کیمیائی تغیرات میں بہت فرق ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ظاہر بین نگاہوں کو یہ الفاظ خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس بات کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہیے کہ یہ محض "بیرون در" کی دلفریبیاں ہیں "درون نہا" اس قسم کی سطحی اور گمراہ کرنے والی دلفریبیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ایک ایک لفظ کو لے لیجے۔ اور اُس کے مفہوم پر غور فرمائیے۔ جب ہم تانبا کبریت وٹ کہینگے تو سننے والا یہی سمجھگا کہ متکلم تانبے کو کبریت سے تشبیہ دے رہا ہے۔

مثال کے طور پر گندک کے چند مرکبات کے نام ملاحظہ فرمائیے۔
اور انگریزی میں ان کے لئے جو امتیازی علامات مقرر ہیں
ان کو دیکھئے:—

Hydrosulphuric Acid or **Hydrogen Sulphide** ($H_2 S$)

Sulphurous Acid ($H_2 SO_3$)

Sulphuric Acid ($H_2 SO_4$)

Sulphonic Acid ($R \cdot SO_2 \cdot OH$)

Sulphinic Acid ($R \cdot SO \cdot OH$)

Thio Sulphuric Acid ($H_2 S_2 O_5$)

Thionic Acid $S_n \begin{cases} SO_2 \cdot OH \\ SO_2 \cdot OH \end{cases}$

Thionyl Chloride ($SO Cl_2$)

Sulphuryl Chloride ($SO_2 Cl_2$)

یہ چند نام ہیں جن میں گندک کے انگریزی ناموں
کے ساتھ امتیازی علامتیں استعمال کی گئی ہیں۔ اب آپ گندک
کے نام کے ساتھ اپنی اُردو کی ایک ایک علامت لگاتے جاتیے۔
اور دیکھئے اس کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس سے آپ کو یہ بھی معلوم
ہو جائیگا کہ فن حاصل کرنے والوں کے لئے تسمیہ کا یہ طریق زیادہ
سہل اور زیادہ مطلب نیز ہے یا وہ طریق جس میں تسمیہ کی
ابتدا Radicals کے ناموں سے ہوگی۔ چند مثالیں اور
ملاحظہ فرمائیے:—

مثلاً

Copper Sulphide	یا تانبا کبریت وٹ	تانبا گند کیلا
Copper Sulphite	یا تانبا کبریت آگین	تانبا گندک آسا
Copper Sulphate	یا تانبا کبریت آمود	تانبا گندک گون
Copper Sulphonate	یا تانبا کبریت آمیز	تانبا گندک مان
	وغیرہ	وغیرہ

ان الفاظ پر غور کرو۔ یہ کسی فن کے مطالب کو تعبیر کرتے ہیں یا کوئی چیستان بیان ہو رہی ہے!! کیمیا کے لئے یہ الفاظ بالکل بے معنی ہیں۔ ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں کہ کیمیا کی زبان میں کام دے سکتا ہو۔ ہاں توڑ مروڑ کر کچھ مفہوم پہنا دیا جائے تو ممکن ہے کہ کسی طبعی واقعہ کی تعبیر ہو سکیں۔ لیکن طبعی واقعات اور کیمیائی تغیرات میں بہت فرق ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ظاہر بین نگاہوں کو یہ الفاظ خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس بات کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہیے کہ یہ محض "بیرون در" کی دلفریبیاں ہیں "درون خانہ" اس قسم کی سطحی اور گمراہ کرنے والی دلفریبیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ایک ایک لفظ کو لے لیجے۔ اور اُس کے مفہوم پر غور فرمائیے۔ جب ہم تانبا کبریت وٹ کہینگے تو سننے والا یہی سمجھگا کہ متکلم تانبے کو کبریت سے تشبیہ دے رہا ہے۔

یا کسی ایسے تانبے کا ذکر کر رہا ہے جو کبریت کے مانند ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس چیز کا نام تانبا کبریت و ش رکھا گیا ہے وہ نہ تانبا ہے نہ کبریت۔ وہ تو ایک ایسی چیز ہے جس میں تانبا اور کبریت دونوں اپنی اپنی جداگانہ ہستی کھو چکے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے نام پر غور فرمائیے۔ کیمیا دان کی نگاہ میں Copper sulphite سے ایک ایسی چیز مراد ہے جو Copper radical کے ساتھ Sulphite radical کے ترکیب کھانے سے پیدا ہوئی ہے۔ اور اب اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں نہ تانبا اپنی ہستی پر قائم ہے نہ گندک نہ آکسیجن۔ اس چیز میں جو خواص پائے جاتے ہیں وہ خواہ طبعی ہوں خواہ کیمیائی اجزائے ترکیبی کے خواص سے کلیتہً جداگانہ ہیں۔ اب اس مفہوم کو نگاہ میں رکھئے اور اپنے رکھے ہوئے نام پر غور فرمائیے۔ جب ہم تانبا کبریت آگین کہینگے تو یہ لفظ معنی کس چیز پر دلالت کریگا؟ سننے والے کا ذہن بلاشبہ اسی طرف منتقل ہوگا کہ متکلم تانبے کا نام لے رہا ہے جس کے اندر کبریت بھری ہوئی ہے اور ان دونوں چیزوں کو ایک دوسری کے ساتھ اس طرح اقتراب ہوا ہے کہ ان کی اپنی اپنی جداگانہ ہستیوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اسی نام کو ایک اور پہلو سے دیکھئے۔ جس چیز کے لئے ہم نام تجویز کر رہے ہیں۔ وہ تانبے کبریت اور آکسیجن کا کیمیائی مرکب ہے۔ اور ہم اسے تانبا کبریت آگین کہتے ہیں۔ یعنی صرف تانبے اور کبریت کے

ناموں کو سامعین کی نگاہ کے سامنے لاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ آکسیجن نے کیا تصور کیا ہے کہ اُسے نظر انداز کر دیا جائے؟ اور کیا وجہ ہے کہ اسی چیز کو تانبا مائین آگین نہ کہا جائے؟

ایک صورت البتہ قابل لحاظ ہے۔ یعنی ہم اس بات پر اتفاق کر لیں کہ جب کبریت آگین کہا جائیگا تو اُس سے کوئی ایسا مرکب یا کسی مرکب کا کوئی ایسا جُز مراد ہوگا جو کبریت اور مائین پر مشتمل ہے۔ لیکن یہاں اس بات پر بھی غور فرمائیے کہ ظاہر کی ایک ذرا سی وہمی و لفظی کی خاطر ہمیں چار Conventions کا بوجھ اٹھانا پڑیگا۔ پہلا Convention یہ ہوگا کہ ایک ایسا لفظ، جس میں کیمیائی تفسیر پر دلالت کرنے کی قابلیت نہیں، اُسے ہم کیمیائی تفسیر کو تعبیر کرنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔

دوسرا Convention یہ ہوگا کہ کبریت آگین کے مفہوم میں کبریت کے علاوہ ایک اور عنصر یعنی مائین بھی شامل ہے جس کے نام کی لفظ مذکور میں بُو تک موجود نہیں۔

تیسرا Convention یہ ہوگا کہ کبریت آگین کے لفظ کو جن دو عناصر کے تعبیر کرنے کے لئے اپنا پُناپ اختیار کر لیا گیا ہے وہ باہم اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ اُن کے ماپ سے ایک مستقل Radical بن گیا ہے۔ اور

چوتھا Convention یہ ہوگا کہ اس Radical میں کبریت

اور مائین کے جوہروں (Atoms) کا تناسب ۱:۳ ہے۔
 خیال فرمائیے یہ نام جن سے میں بحث کر رہا ہوں یہ
 پہلے تو خود Conventional نام ہیں۔ اور پھر ہر ایک
 کے ساتھ اتنے اتنے Conventions لگے ہوئے ہیں۔
 وہ کون خوش نصیب ہوگا جس کا دماغ اتنے
 Conventions کا متحمل ہو جائیگا!! اس کے ساتھ
 ساتھ اس بات کا بھی لحاظ فرمائیے کہ یہ ایک دو نہیں بلکہ
 کئی نام ہیں۔ اور فن ایک حال پر ٹھہرا ہوا نہیں۔ اُس میں
 روز بروز ترقی ہو رہی ہے۔ علاوہ بریں ان Conventions
 کے ساتھ ساتھ ہمارے کیمیائی تسبیہ میں وہ چھوٹے
 چھوٹے Conventions بھی ہونگے جن کے بغیر کوئی
 چارہ نہیں۔

میرے مخدوموں کو غالباً اس خیال نے دھوکے
 میں ڈال دیا ہے کہ یورپ کی زبانوں میں 'Ide' 'ite'
 'Ate' وغیرہ صفت یا نسبت کی علامتیں ہیں۔ اور جس طرح
 یورپ میں کیمیا کے لئے ان علامتوں کا اپنا اپنا مفہوم
 قائم ہو گیا ہے اسی طرح وقت پا کر ہمارے ہاں بھی ہماری اپنا اپنا
 اختیار کی ہوئی علامتوں کا اپنا اپنا کیمیائی مفہوم قائم ہو جائیگا۔
 لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ ہم اُس زمانہ سے فن کی ابتدا
 نہیں کر رہے ہیں جس میں یورپ والوں نے اس کی ابتدا
 کی تھی۔ ہم ایک بنا بنایا فن لے رہے ہیں جس میں الفاظ

تو وہی ہیں جو یورپ والوں نے ابتداء میں اختیار کر لئے تھے۔ لیکن اُن کے مفہوم میں فن کی ترقی کے ساتھ ساتھ بہت کچھ تراش خراش ہوتی گئی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم یورپی اصطلاحات کا وہ مفہوم نہیں جو آج فنِ کیمیا میں اُن کے لئے قائم ہو چکا ہے۔ اور اُس ابتدائی مفہوم پر حصر کر لیں جو اُس زمانہ میں ان اصطلاحات کا مفہوم تھا جب دنیا کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ جن چیزوں کے نام رکھے جا رہے ہیں اُن کی کیمیائی اصلیت کیا ہے؟ میں یہ نہیں کہتا کہ ابتدا میں 'Ate'، 'Ite'، 'Ide' وغیرہ صفت یا نسبت کی علامتیں نہ تھیں۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ کیمیا میں اب ان کا مفہوم یہ نہیں۔ مثلاً جب ہم Copper Sulphate کہتے ہیں تو اس نام سے "گندک والا" تانبا مراد نہیں ہوتا۔ اس سے وہ تانبا مراد ہوتا ہے جو اب تانبا نہیں رہا بلکہ SO₄ Radicals کے ساتھ اُس کے جوہر (Atoms) اس طرح ترکیب کھا گئے ہیں کہ ان دونوں کی ترکیب سے ایک جداگانہ چیز بن گئی ہے جسے ہم Copper Sulphate کہتے ہیں۔ اس بنا پر کیمیا کی زبان میں Copper Sulphate کے معنی حسبِ ذیل ہو سکتے ہیں:—

A compound in which copper has been rendered sulphate.

or A Compound in which copper has been converted into sulphate.

or better, A compound in which copper has been sulphated

ان جملوں سے اصطلاحِ مذکور کا پورا پورا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ تاہم اتنی بات ضرور معلوم ہو جائیگی کہ اصطلاح کے ابتدائی مفہوم اور موجودہ مفہوم میں کیا فرق ہے۔ اور آپ کی توجہ کو اصلیت کی طرف مبذول کرنے کے لئے غالباً اتنا ہی کافی ہوگا۔

بات یہ ہے کہ ہر فن کی اپنی مخصوص زبان ہوتی ہے اور اُس کے مطالب اُسی زبان میں ادا ہو سکتے ہیں۔ کسی ایک فن کی زبان میں جب دوسرے فن کی زبان کے الفاظ اور محاورے ملائے جاتے ہیں تو یہی نہیں ہوتا کہ بیان بھونڈا ہو جاتا ہے بلکہ اس سے ایک اور خرابی پیدا ہوتی ہے جس کے نتائج نہایت مضر ہیں۔ یعنی مطالب ڈھنڈلے ہو جاتے ہیں۔ اور متکلم اپنے سامعین کے دل میں جو کیفیت پیدا کرنا چاہتا ہے وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ مثلاً تاریخ کے لئے ناول کی زبان اختیار کر لی جائے تو تاریخ، تاریخ کی بجائے ناول ہو جائیگی۔ اور ہم نے تو

زبان کے اعتبار سے 'شعری'، 'غزل'، 'قصیدہ' وغیرہ تک
 کی حد بندی کر رکھی ہے۔ ہمارے ہاں ابھی فنِ کیمیا
 کے لئے کوئی زبان مقرر نہیں ہوئی۔ اس لئے آپ کو
 اس بات کا سہارا مل سکتا ہے کہ ہم جو الفاظ استعمال
 کرینگے ان ہی الفاظ کو رواجِ اس فن کے ساتھ مخصوص
 کر دیگا اور اسی طرح ہوتے ہوتے کیمیا کے لئے ایک
 خاص زبان بن جائیگی۔ یہ خیال بظاہر کچھ بے جا معلوم
 نہیں ہوتا۔ لیکن حقیقت میں یہ سہارا ایک مہل سہارا
 ہے۔ اس پر حصر کر لینا اور دنیا کو خواہ مخواہ ایک
 ہیبت ناک امتحان میں ڈال دینا قرینِ مصلحت نہیں۔
 ہمیں اپنی غلطیوں کو اس بھروسے پر رواج کے
 حوالہ نہ کر لینا چاہیے کہ سراج خود بخود اُنہیں ٹھیک
 کر لیگا۔ یا ان غلطیوں کو وہی مفہوم پہننا دیگا جو ہم پہنانا
 چاہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے پاس فنِ کیمیا
 کی زبان موجود نہیں۔ لیکن پھر اس سے بھی تو انکار
 نہیں ہو سکتا کہ کم از کم معمولی کاروبار کے لئے تو ہمارے
 پاس ایک زبان موجود ہے۔ اور اس زبان میں توسیع
 کے لئے بہت کچھ گنجائش ہے۔ ہمارا فرض یہ ہونا چاہئے
 کہ اپنی زبان کا کون کونسا تلاش کریں۔ اور اس میں سے
 وہ وہ الفاظ ڈھونڈ کر نکالیں جو فنِ کیمیا کی زبان میں
 داخل ہونے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اور دوسری زبانوں کے

جو الفاظ اختیار کریں، انہیں بھی اسی کسوٹی پر گس کر دیکھتے جائیں۔ ہم یہ روش اختیار کر لینگے تو ہمارے پاس ایک ایسی زبان بنتی جائیگی جو اس قابل ہوگی کہ فنِ کیمیا کے مطالب اُس میں بخوبی ادا ہو سکیں گے۔ اور اگر ہم اپنی ہی سہولتوں کو مد نظر رکھیں گے۔ اور فن کی ضروریات کو نظر انداز کر کے محض سراج کے بھروسے پر انابِ شناپ الفاظ اختیار کرتے جائیں گے تو آنے والی نسلوں کے لئے فائدہ کی بجائے ایک فتنہ بپا کر دیں گے۔ پھر ظاہر ہے کہ ایسا کرنے سے کچھ نہ کرنا ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس لئے میری التجا یہ ہے کہ "بیرونِ در" کی دلفریبیوں اور سہولتوں سے گزر کر "درونِ خانہ" کی مشکلات اور ضروریات کو بھی دیکھ لیجے۔ اور رواج پر بھروسا کر لینے سے پہلے اس بات کو بھی ملاحظہ فرمالیجے کہ جن لوگوں کا آپ متبع کرنا چاہتے ہیں وہ خود اس رواج سے تنگ آپکے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارا کیمیائی تسمیہ

اگر Radicals کے ناموں پر بنی ہوگا اور Radicals کے تسمیہ میں اس بات کا التزام رہیگا کہ ناموں سے Radicals کی ترکیب روشن ہوتی جائے تو کیمیائی تسمیہ کی بہت سی مشکلات رفع ہو جائیں گی۔ پھر میں نے یہ بھی کہا تھا کہ تسمیہ میں عناصر کے ناموں کو افعال کے طور پر استعمال کر لینا چاہیے۔ ان

ناموں کو افعال کے طور پر استعمال کر لیا جائیگا تو تسمیہ کے لئے اختیار کئے ہوئے لفظوں میں کیمیائی تغیرات پر دلالت کرنے کی قابلیت پیدا ہو جائیگی۔ اب یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ طریقہ کہاں تک کام دے سکتا ہے۔ اور اس سے فنِ کیمیا کی ضروریات کس حد تک پوری ہو سکتی ہیں۔

اس بحث میں اُبھرنے سے پہلے اس بات کا تصفیہ کر لینا ضروری ہے کہ عناصر کے ناموں کو افعال کے طور پر استعمال کرنے کے لئے کس زبان سے کام لینا چاہئے۔ میرے اسلامی جذبات اس مقام پر پہنچ کر عربی کو ترجیح کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ عناصر کے ناموں سے اسمِ مفعول کا صیغہ وضع کر لیا جائے تو کام چل سکتا ہے۔ لیکن انہوں نے یہ صورت عملاً کار آمد نہیں۔ اس سے عناصر کے ناموں کی ہیئت اس قدر مسخ ہو جائیگی کہ اصلیت کا تلاش کرنا سخت مشکل ہوگا۔ پھر ایک اور مشکل بھی ہے جو اس سے زیادہ قابلِ لحاظ ہے۔ یعنی عربی کی صرف و نحو میں مرکبِ افعال کی گنجائش نہیں۔ اس لئے جب ساوہ Radicals سے گزر کر ہم مرکبِ Radicals پر پہنچینگے تو عربی صاف جواب دے دیگی۔ مثلاً کاربن کو فحم مان کر Carbide radical کو ہم مفخم کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جب اس Radical کی باری آئیگی جو کاربن اور آکسیجن سے مرکب ہے (CO₂)

تو اُسے کیا کہا جائیگا؟ عربی کے بعد اُردو پر نگاہ پڑتی ہے۔ اور اُردو کے لئے "اپنی زبان" کے نام کی سفارش ایسی زبردست سفارش ہے کہ طبیعت خواہ مخواہ اسی کو اختیار کر لینا چاہتی ہے۔ لیکن اس میں بھی کئی دقتیں ہیں جن کا خیال نہ رکھا جائیگا تو ہماری کوشش کی منزلیں صعب سے صعب تر ہو جائیں گی۔ اُردو سے کام لینے میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ تسمیہ میں ہمیں پیشتر فعل کی اُس شکل سے کام لینا ہے جو اسم مفعول کے لئے مخصوص ہے۔ اور اُردو میں اسم مفعول کی علامت کے طور پر ایک پورا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور اگر افعال کو توڑ مروڑ کر اسم مفعول کے لئے کوئی مختصر سی شکل پیدا کر لی جائے تو اس صورت میں بھی یہ مشکل باقی رہ جاتی ہے کہ ہمارے اختیار کئے ہوئے تسمیہ میں "انٹرنیشنل" (بین الاقوامی) بننے کی قابلیت پیدا نہیں ہوتی۔ علاوہ بریں ہمارے حروف مغیرہ و تالیغ مغیرہ کا عمل اس طرح بنائے ہوئے الفاظ کی ہیئت مسخ کر دیگا۔ اور یہ بات ضرر سے خالی نہیں۔ اس قسم کی مشکلات نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ فارسی سے کام لوں۔ فارسی میں خوبی یہ ہے کہ اس میں افعال کے ساتھ خسرا خسرا سی علامتیں لگا دینے سے، یا اسماء اور افعال کو باہم ترکیب دے دینے سے چھوٹے چھوٹے اور خوبصورت الفاظ

بن جاتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کیمیائی تسمیہ میں اس قسم کے الفاظ سے کام لیا جائیگا تو تسمیہ نہایت آسانی سے "انٹرنیشنل" بن سکیگا۔ میرے معترضین کو شاید اس پر یہ اعتراض ہوگا کہ ہم اُردو بولنے والے ہیں۔ اس لئے فارسی زبان سے کام لینا قرینِ مصامت نہیں۔ لیکن یہ اعتراض ایک سطحی سا اعتراض ہے جو صرف اعتراض ہی کی خاطر پیش ہو سکتا ہے۔ فارسی اُردو کا ایک ایسا جز ہے کہ اُسے اُردو سے کوئی خاچ نہیں کر سکتا۔ علاوہ بریں الفاظ کی جو ترکیبیں ہم استعمال کریں گے وہ اُردو میں یہاں تک رائج ہو چکی ہیں اور یہاں تک ہر کہ وہ کی زبان پر جاری ہیں کہ اب انہیں اُردو کی ترکیبیں نہ سمجھنا اور اُردو کی صرف و نحو سے خاچ کر دینا سخت نادانی ہے۔

یہ بات البتہ قابلِ لحاظ ہے کہ عناصر کے نئے جو نام تجویز کئے گئے ہیں ان میں بعض ہندی، بعض فارسی اور بعض عربی ہیں۔ ہم ہر ایک پر فارسی صرف و نحو کے احکام جاری کریں گے۔ اور یہ آزادی "اُردو فصحا" کی شریعت میں جائز نہیں۔ لیکن اس اعتراض کو پیش کرتے وقت یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اظہارِ مافی الضمیر کی ضرورت الفاظ کی آرائش و زیبائش اور فصاحت کے لوازمات پر بہر کیف مقدم ہے۔ پھر زبان کے اصول جن چیزوں کی اجازت دیتے ہیں اور الفاظ کی جن شکلوں کو

اہل زبان بلا تکلف سمجھ لیتے ہیں انہیں اظہارِ مافی الضمیر کی ضرورت سے استعمال کر لیا جائے تو اس میں کیا ہرج ہے؟ اور پھر ہم تو اس آزادی سے صرف ایسے موقعہ پر کام لے رہے ہیں جہاں ہمارے فصحا کی فصاحت کے تمام لوازمات، اظہارِ مافی الضمیر سے عاجز آگئے ہیں۔

اس بات کی طرف پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ مختلف زبانوں کے الفاظ کو ترکیب دے کر بیان کے لئے ایک نیا پیرایہ پیدا کر لینا اصول السنہ کی خلاف ورزی نہیں۔ اب یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ایک زبان کے الفاظ پر دوسری زبان کی صرف و نحو کے احکام جاری کر لینا بھی عین جائز ہے۔ اس آزادی کی دو صورتیں حسب ذیل ہیں:—

(۱) زبانوں میں یہ بات عام دیکھنے میں آتی ہے کہ اہل زبان غیر زبانوں کے الفاظ لیتے ہیں اور انہیں اپنی زبان کی صرف و نحو کی تابع کر لیتے ہیں۔ چنانچہ آپ کی اردو میں بھی اس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً فرمان سے فرمانا، بدل سے بدلنا، بخش سے بخشنا، خرچ سے خرچنا، قبول سے قبولنا، انگیز سے انگیزنا، لرز سے لرزنا، نواز سے نوازنا، بحث سے بحثنا، گرم سے گرمنا، گم سے گمانا، وغیرہ وغیرہ بن گئے ہیں۔

فارسی میں بھی اس آزادی کی بیسیوں مثالیں موجود ہیں۔ دیکھ لیجئے فہم سے فہمدن، رقص سے رقصیدن

غارت سے فارتیدن، طلب سے طلبیدن، شہم سے شمیدن،
 مکر سے مکریدن، طوف سے طوفیدن، وغیرہ وغیرہ کس طرح
 بن گیا ہے۔ اور امیر خسرو کی خوش وقتی دیکھئے کہ
 چلنا سے چلیدن بنا کر فارسی میں چلا دیا۔ عربی کی آزاد منشی
 اس سے بھی زیادہ قابلِ داد ہے کہ سیر سے سیریدن،
 بمعنی رفتن فرض کر لیا اور اُس سے فارسی طور پر سیر
 کا اشتقاق کیا ہے:—

کرم گفتا پرتار است بے غیر
 بیادستِ تخیل گیر دے سیر
 اور سالک یزدوی نے تمیز سے تمیزیدن، بمعنی تمیز کردن
 مان لیا ہے اور اُس سے مضارع کے طور پر تمیزد استعمال
 کرتا ہے:—

سالک نفروشدند با بادۂ صافی
 کو ذائقہٴ محبتے تا بہ تمیزد
 (ب) زبانوں میں یہ آزادی بھی عام ہے کہ اپنی
 زبان کے الفاظ پر غیر زبانوں کی صرف و نحو کے احکام لگاتے
 ہیں۔ اور اس طرح نئے الفاظ بنا کر اپنی زبان میں استعمال
 کرتے ہیں۔ اس کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ تراش سے ترش
 (زلفِ ترش)؛ زیب سے مزیب (لباسِ مزیب)؛ لب سے لبب
 (جامِ لبب)؛ طلا معربِ تلا سے مطلا (روحِ مطلا)؛ زلف
 سے مزلف (موئے مزلف)؛ باہ سے مہتی (معجونِ مہتی)؛

دوغن سے مرغن، نرد سے نراد، وغیرہ وغیرہ بن گیا ہے اور لطف یہ کہ یہ آزادی مفردات سے گزر کر مرکبات تک پہنچ گئی ہے۔ اور خوش مذاق اہل زبان نے ششدر سے ششدر، زرکش سے مزرکش (جامیہ مزرکش) بنا لیا ہے۔ اس بوالعجبی کی بھی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

مترش

لامفید بلخی :-

ہر گل کہ خار خار طمع سہر زند ازو

در دیدہ بد قماش چو روئے مترش است

منصور :-

از بسکہ بہمدان بڈ یار شدی

چوں حسن مترش بنظر خوار شدی

ابونصر بدخستانی :-

تزد مسلمان نہ بود شایان

بہر امامت مرد مترش

نغمیت :-

گے دہقان زن وگہ پیر دہقان

گے گبر مترش گے مسلمان

مزئیب

واله هروی : —
تاریخ بناش گفت والد
حمام شریف شد مزئیب

مزلف

شوکت : —
مزلف است رخ خامه ام ز بخت سیه
سوادشام فراقم خط لب جام است

علی خاں موجی : —

مزلف چون شود دلبر بدلت می رسد عاشق
خط مشکین او خاصیت بالی هادارد

وحید : —

چنین گر زیر خط پوشیده حنش می برد دل را
عجب دارم که آل شوخ مزلف آدمی باشد

مشدر

ظہیر فاریابی: —

ہرہ گل شد زین وز روئے ہر آں ہرہ را
بر بساطِ امراد نقشِ مشدر یافتند

کمال اسمعیل: —

بدان خدائے کہ بنمود زیر نہ رقعہ
سہ ہرہ را بمشدر ز نقشِ ہفت و چہا

نژاد

نعمت خان عالی: —

نژادِ فلکِ غلط اندازِ عجب ہرہ بطاس انداخت۔

پہم عربی کی تائے مصدری لگا کر مصدر
بنا لینے کی آزادی تو اتنی عام ہے کہ جہاں
چاہتے ہیں تائے مصدری کے عمل سے بلا تکلف
نئے نئے الفاظ بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ فلاکت، نزاکت،
بادشاہت، زندیت، فارسیت، رنگت وغیرہ بیسیوں
الفاظ ہیں کہ روزانہ ہماری زبان پر جاری رہتے ہیں۔

عربی لفظوں کے ساتھ فاعل، صفت، ظرف،
تصغیر وغیرہ کی علامتیں اس طرح چسپاں کر دی جاتی ہیں
کہ گویا فارسی الفاظ استعمال ہو رہے ہیں۔ دولت مند،
حاجت مند، طالع مند وغیرہ۔ نعلین، طرب ناک، غمناک،

خونناک، طبیبی، نقارچی، قلعہ کی وغیرہ۔ صنم کدہ، دولت کدہ وغیرہ۔ طفلک، فہک، عینک، صندوقچہ، وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔

یائے مصدری کا استعمال مفردات سے گزر کر مرکبات تک پہنچ گیا ہے۔ مثال کے طور پر زیادتی، سلامتی، صفائی، خوش اخلاقی، خوش وضعی، خوش طبعی، بد مذاقی، دولت مندی، حاجتمندی، طالع مندی، اقبال مندی، اقبال بلندی، شاہ شکوہی، وغیرہ کو ملاحظہ فرمائیے۔ پھر میں اشد ضرورت کے وقت نڈر باشی، امرت نوشی وغیرہ استعمال کر لوں تو اس پر آپ کو اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟ عجیبی الفاظ کی جمع اس طرح بناتے جاتے ہیں

کہ گویا خالص عربی الفاظ بول رہے ہیں۔ مثال کے لئے افغان سے افغانہ، ترکمان سے تراکمہ، فرمان سے فرامین، بیگم سے بیگمات، باغ سے باغات وغیرہ بیسیوں الفاظ

موجود ہیں۔ اور فارسی قاعدوں سے عربی اسماء کی جمع بنا لینے کا دستور تو اتنا عام ہے کہ اس پر کوئی اعتراض کی جرات نہیں کر سکتا۔ عربی کہتا ہے۔

خدائے عزوجل صحتم دہد بینی کہ ایں منافقگاں را چہ آدم برسر

آپ خود اپنی اُردو میں بیسیوں فارسی اور ہندی الفاظ

کے ساتھ جمع کی علامت ات بلا تکلف لگا دیتے ہیں۔ اور دوسری

طرف عربی فارسی وغیرہ کے الفاظ کی جمع اُردو قاعدوں سے بناتے چلے

جاتے ہیں پھر اس سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ ہندی والوں

نے جس طرح پینا سے پیاس، کرنا سے کراس، گنا سے ہگاس،

موتنا سے 'متاس' کا اشتقاق کیا اسی طرح رہنا سے رہاں بنایا۔ یہی لفظ آپ کے ہاتھ میں آیا تو آپ نے اس میں فارسیانہ تصرف کیا اور اُس کی شکل بدل کر اس طرح رہائش بنا لیا کہ گویا فارسی میں کوئی مصدر "رہودن" ہے جس سے اشتقاق کر رہے ہیں۔

اس قسم کے الفاظ نہایت آزادی سے استعمال ہوتے ہیں اور لطف یہ کہ اس جرم کے ارتکاب میں ہندی اور ایرانی دونوں برابر کے حصہ دار ہیں۔ پھر کیا ضرورت کا حکم اتنا قوی نہیں کہ میں بھی اس آزادی سے فائدہ اٹھا کر ایک ایسی ضرورت کو پورا کر لوں جو اور کسی طرح پوری نہیں ہو سکتی اور میرے مخدوم اس پر اعتراض نہ کریں؟ یہاں اس بات کا جتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں ان آزادیوں کی تعمیم کا طلبگار نہیں۔ صرف ضرورت کو پیش نظر رکھتا ہوں۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ مختلف زبانوں کے الفاظ کو باہم ترکیب دے کر نئے الفاظ بنا لینا، غیر زبان کے الفاظ کو اپنی زبان کی صرف و نحو کی تحت میں لے آنا، اور اپنی زبان کے الفاظ پر غیر زبان کی صرف و نحو کے قواعد جاری کر لینا، اصول فصاحت کی خلاف ورزی نہیں تو میرے اجاب اعتراض کے لئے ایک نیا رستہ پیدا کریں گے۔ اور یہ کہیں گے کہ غیر زبان کے الفاظ پر اپنی صرف و نحو کے احکام جاری کرنا، یا اپنی زبان کے الفاظ کو غیر زبان کی صرف و نحو کے تابع

کر دینا، اور بات ہے۔ اور غیر زبان کے الفاظ پر اُسی زبان
 یا کسی اور زبان کے احکام جاری کرنا، اور بات ہے۔
 مثلاً فارسی الفاظ سے فارسی الفاظ کا اشتقاق کرنا یا فارسی
 الفاظ کو ترکیب دے کر مرکب فارسی الفاظ بنا لینا صرف
 فارس والوں کا حق ہے۔ ہم اس آزادی سے فائدہ
 نہیں اُٹھا سکتے۔ لیکن یہ اعتراض محض تنگ نظری کا
 نتیجہ ہے۔ یہ آزادی تو وہ آزادی ہے جس سے ہمارے
 ملک کے اہل زبان مدت سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔
 اور اس طرح الفاظ بنا لینے کا اصول ہماری زبان میں
 اتنا علم ہو چکا ہے کہ اب ہم راستے اپنی زبان کی
 صرف و نحو سے خارج نہیں کر سکتے۔ نہ ہمارے فصحا
 میں اتنی طاقت ہے کہ اس طرح بنے ہوئے الفاظ کو
 ”سماعی“ کہہ کر اہل زبان کی زبان بند کر دیں۔ واقعہ یہ
 ہے کہ ہماری زبان میں جو اس قسم کے الفاظ پیدا
 ہوئے ہیں وہ محض الفاظ کی حیثیت سے پیدا نہیں ہوئے۔
 بلکہ اس طرح پیدا ہوتے ہیں کہ اُن کے ساتھ ساتھ
 ہماری زبان میں ادائے مطالب کے لئے ایک پیرایہ
 پیدا ہو گیا ہے۔ اور اُردو بولنے والی دنیا اس پیرایہ
 سے یہاں تک آشنا ہو چکی ہے کہ اب اسے جزو زبان
 سمجھنا چاہیئے۔ اس پیرایہ کو اپنی زبان سے خارج سمجھ لینا
 گویا اپنی زبان کی صرف و نحو کا ایک عضو کاٹ کر

پھینک دینا ہے۔ ذیل میں اس آزادی کی بھی چند مثالیں درج کر دیتا ہوں:—

روشنائی (سیاہی) اور سیاہی خود، دستاں، شبنم،
تن زیب، جامانی، کاماتی، وغیرہ۔ رہباری، فارغ خطی،
دست پناہ یا دسپناہ، خوش دامن، جمعدار، رسالدار، برقدار،
ازبیلی وغیرہ وغیرہ۔

میرے مخدوم جو ان دعویوں سے کہ "نئے"
الفاظ کا بنانا ناجائز ہے، اصطلاحات وضع کرنے کا حق
بھی ہم سے چھین لینا چاہتے ہیں ان کی توجہ کے لئے
اگر یہ عرض کروں کہ یہ اور اس قسم کے اور بہت سے الفاظ
"نئے" بنے ہوئے ہیں، تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ پھر ان میں
بعض وہ بھی ہیں جن کے متعلق ہم بالعمین بتا سکتے ہیں
کہ کب بنے، کیونکر بنے، اور کس نے بنائے۔ چند مثالیں
ملاحظہ ہوں:—

اکبر اور جہانگیر کی خوش مذاقیوں نے بیسیوں "نئے"
الفاظ بناوئے۔ ان میں ایک شہوت بھی تھا جو آج تک
ہندوستان میں رائج ہے۔ بھنگی کو "ہلاک خور" کہتے تھے۔
اکبر نے حلال خور کہا اور قبول عام نے اس محبت سے یا
کہ آج تک موجود ہے۔ نواب سعادت علی خاں نے ملائی
کا نام بالائی رکھا۔ آج تک لکھنؤ کے بچے بچے کی زبان
پر ہے اور دوسرے مقامات کے اردو دان بھی اس سے

نا واقف نہیں۔ محمد شاہ نے ببل کے لئے گلدم کا لفظ وضع کیا اور ہمارے "اردو فصحا" کی زبان اس کی شہرت کو دبا نہ سکی۔ اسی رنگیلے بادشاہ نے سنگترہ کے لئے رنگترا کا نام تجویز کیا اور خود انصاف فرمائیے آج ہمارے فصحا دونوں میں سے کس کو ترجیح کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جہانگیر نے شراب کا راہرنگی نام رکھا اور گو قبول عام کے درجہ پر نہ پہنچا تاہم کسی نہ کسی صحبت میں آج بھی زبان پر آہی جاتا ہے۔ محمود غزنوی نے ہندوستان میں آکر آم کھایا تو اُس کی لطافت کے مزے لے کر خوش ہوا۔ نام سُنا تو پسند نہ آیا۔ کہا اس کا لغزک نام ہونا چاہئے۔ اور قبولیت کا لطف ملاحظہ ہو کہ شعرا تک نے ہاتھوں ہاتھ لے لیا۔ دیکھو اس واقعہ کو صدیاں گزر گئی ہیں۔ اور انصح الشعراء ہند امیر خسرو کس مزے سے نام لیتا ہے۔

لغزک خوش مغزکن بوستاں

خوب ترین میوہ ہندوستان

یہاں اس بات پر بھی غور فرمائیے کہ الفاظ کی دنیا میں محمود اور اتابک کا سکہ اتنا رائج نہ تھا جتنا فردوسی اور سعدی کا۔

ان ترکیبوں کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ

ایران والوں نے انہیں قبول نہیں کیا تو میری تجویز پر اعتراض کرنے والوں کی نگاہ میں یہ ایک نہایت وقیع اعتراض ہوگا۔ لیکن اس بات کو بھولنا نہ چاہیے کہ ایرانیوں کے ان ترکیبوں کو قبول نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اپنی زبان سے اپنی ہی زبان کا ایک مستحسن پیرائے بیان خارج کر دیں۔ ہندوستانیوں نے اس بات کا کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ یہ ترکیبیں ایرانیوں کے لئے وضع کی گئی ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس مطلب کے لئے وضع کی گئی ہیں وہ ان سے بخوبی پورا ہو رہا ہے۔

اجاب کی تسکین خاطر کے لئے یہاں یہ بات بھی جتا دینا چاہتا ہوں کہ ایرانیوں نے جو ہماری وضع کی ہوئی ترکیبوں کو قبولیت کی نگاہ سے نہیں دیکھا تو اس سے بدل نہ ہونا چاہیے۔ ان ترکیبوں کو ایرانیوں کی نگاہ میں قبولیت حاصل نہ ہونا اس بات کا نتیجہ ہے کہ ایرانیوں کو ان ترکیبوں کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن کیمیا کے متعلق جو اسلوب میں اختیار کرنا چاہتا ہوں اس سے ایرانی مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے کہ ایرانی بھی اس کے لئے ہمارے ساتھ برابر کے حاجت مند ہیں۔ اور میں آپ کو یقین دلا سکتا ہوں کہ ایرانی اس فن کی ضروریات کو فن کی نگاہ سے دیکھیں گے تو وہ بھی ان مطالب کو ادا کرنے کے لئے اپنی زبان میں اس سے

بہتر پیرایہ نہ پائینگے۔ اور اگر اہل ایران ضروریاتِ فن کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور یورپ کی کورانہ تقلید کے پابند ہو جائیں تو اُن کی خاطر ہم اپنی آزادیوں سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ علاوہ بریں جب ایران والے خود عربی الفاظ میں تصرف کر رہے ہیں اور اس حالت میں تصرف کر رہے ہیں کہ عرب اُن کے تصرفات کو قبول نہیں کرتے، تو وہ ہمیں اس قسم کے تصرفات سے کس طرح روک سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

فلک سے منفلوک، بمعنی فلک زدہ کس نے بنا لیا؟ عربی میں یاس سے یوئس آیا ہے۔ ایران میں آگر مایوس ہو گیا۔ اور کوئی ہے جو اس کی شہرت سے انکار کر سکتا ہے؟ مرسل کی جگہ مرہول، متاثر کی جگہ مائوس اور مروج کی جگہ رائج استعمال کرتے ہیں اور فارسی کا کوئی فصیح اُن پر اعتراض نہیں کرتا۔ پھر عربی میں بہرے کے لئے اصم استعمال ہوتا ہے۔ ایرانیوں نے اس کے مقابلہ میں صحیم بنا کر کھڑا کر دیا۔ غرض کہاں تک لکھتا جاؤں۔ الفاظ کا ایک طومار ہے کہ ان ہی آزادیوں سے بنتا چلا گیا ہے۔ چند مثالیں عرض کرتا ہوں۔ ان سے خود اندازہ فرمایجے کہ فصحا نے خود اپنی فصاحت کی شریعت سے کیسے کیسے ارتدادوں کا ارتکاب کیا ہے!!

عربی:۔

قضا بہ حاکم دانش نوشتہ مصالحتہ
فلک نہ دیدہ کہ مرہول اوچہ مضمون است

باقر کاشی :-

مرغِ آبی کہ شد است مرسول

برفیں منقار آتشیں تن

ظہوری :-

کشتہ مرسول غالباً در راہ

شدہ سوراخ کیسٹہ ارسال

عرفی :-

اگرچہ ہست مبرہن کہ در سیر وجود

موثر اند صفاتِ الانی ماثور

بدرچای :-

مشتری تنہاد نقدے راجعے دربار من

عرفی :-

نوائے مرثیہ صوم و شادیا نہ عید

کشادہ از اثر انبساط گوشِ صمیم

حاذق گیلانی :- اس میں یہ بات بھی دیکھنے کے قابل

ہے کہ شعر میں عربی لفظ بخوبی کھپ سکتا تھا۔ اس پر بھی

شاعر کی نگاہ نے اپنے ہی اہل وطن کی "بنائی ہوئی" شکل انتخاب کی ہے۔

نصیحتے کہ یہ گوشم زبان عالم گفت
چناں بود کہ بلوش صمیم ابکم گفت

مجھے یاد ہے، میرے مخدوم جس آخری حربہ کو ہاتھ میں لے کر میری آزادیوں پر حملہ کریں گے، وہ یہ ہوگا کہ اہل فارس کا عربی الفاظ میں فارسیانہ تصرف یا ہندوستانیوں کا عربی اور فارسی کے الفاظ میں ہندیانہ تصرف بجا ہے۔ لیکن اساتذہ کے کلام میں اس بات کی مثالیں موجود نہیں کہ عربوں نے فارسی اور ہندی الفاظ میں عربیانہ تصرف کیا ہو۔ یا عرب اور فارس کے رہنے والوں نے ہندی الفاظ پر عربیانہ یا فارسیانہ رنگ پڑھا لیا ہو۔ پھر اس سے آگے بڑھیں گے تو یہ فرمائیں گے کہ غیر زبان والوں نے جہاں جہاں عربی الفاظ میں عربیانہ اور فارسی الفاظ میں فارسیانہ تصرفات کئے ہیں وہ ان ہی تک محدود ہو گئے ہیں اور اہل زبان نے انہیں قبولیت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ لیکن اس بحث میں یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ عربی اور فارسی میں حاکم و محکوم کا تعلق رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی عربی اور فارسی کا داخلہ حاکمانہ داخلہ تھا۔ جن لوگوں کو ہم اساتذہ کہتے ہیں ان میں کتنے تھے وہ جن کا دامن حکومت پرستی یا حکومت پرستوں کی تقلید کے داغ سے پاک تھا؟ زبانوں پر

حاکمانہ اور محکومانہ تعلقات کا جو اثر ہوا کرتا ہے وہ بیان کا محتاج نہیں۔ اس صورت میں تغیرات اور اُن کی قبولیت کی رو کا، عرب سے ایران کی طرف اور ایران سے ہندوستان کی طرف چلنا ایک امر طبعی تھا۔ لیکن اس رو کا رخ اس کے برعکس ہو جانا ممکن نہ تھا۔ پھر اساتذہ کے کلام سے اس مطلب کے لئے سند تلاش کرنا اور نطق و بیان کو اساتذہ کی پابندیوں کا مقید کر لینا کس مصاحت پر مبنی ہے؟ زبانوں میں اگر حاکمانہ اور محکومانہ تصرفات جائز ہیں تو کیا ضرورت کا حق اس پر مقدم نہیں؟

ان ابتدائی مرحلوں کو طے کر لینے کے بعد اب اپنی تجویز عرض کرتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ اتنی دیر تک ایسی باتوں میں اُلجھنا پڑا جو فنِ کیمیا سے غیر متعلق ہیں۔ لیکن کیا کروں مجبوری کے حکم سے سب ہی کچھ کر لینا پڑتا ہے۔ ان سہاسروں کو چھوڑ دوں تو میرے مخلدوم پہلے ہی قلم پر میری زبان پکڑ لینگے۔

کیمیائی تسمیہ کی ابتدا سادہ مرکبات کے ناموں سے ہونی چاہئے۔ یہ وہ مرکبات ہیں جن کی ترکیب میں صرف دو اجزاء شامل ہیں۔ اس قسم کے مرکب کا نام اُس کے دونوں اجزائے ترکیبی کے ناموں پر مشتمل ہوگا۔ وہ جُزء جو مقابلہ زیادہ Electro-negative یا اپنے کیمیائی خواص کے اعتبار سے زیادہ ادھاتی ہے اُس کا نام بعد میں

آئیگا۔ اور اُس کے ساتھ Suffix کے طور پر علامت ید استعمال کی جائیگی۔ مثلاً

Hydrogen Sulphide	=	حِضین کبریہ
Sodium chloride	=	نظرونہ سبزیہ
Copper oxide	=	تانا مائید
Potassium Iodide	=	قلویہ بنفشید
Hydrogen oxide	=	حِضین مائید
Magnesium Nitride	=	مغنیسیہ شرجید

اس میں کبریدن (بمعنی "گندکانا") وغیرہ کا وجود مان کر فارسی طور پر اشتقاق کیا ہے۔ زبان کے اعتبار سے اس ترکیب کی خوبی ظاہر ہے۔ پھر ہر نام کو دیکھ لیجے خود بخود کیمیائی تغیر کا پتہ دیتا ہے۔ کیمیائی تعامل کے وقت مادہ کے جو واردات ہوتے ہیں اور تعامل کے بعد مادہ جو شکل اختیار کرتا ہے اُسے کیمیا دان کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اُس کو تعبیر کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی پیرایہ نہیں مل سکتا۔ اور لطف یہ کہ نام Conventions کی قید سے آزاد ہیں۔ علاوہ بریں فارسیت کے اعتبار سے بھی یہ ترکیب غلط نہیں۔ یہ آپ کے خون آلود اور زہر آمود کا متبع ہے۔

اس مقام پر یہ اتفاق بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ ہمارے ہندو بھائی بھی اس موقع پر یہی علامت "ید" استعمال کر رہے ہیں۔ مثلاً

دو Silicide کو شولید، Iodide کو نیلید، Chloride

کو ہرید ' Sulphide کو گندھید، وغیرہ وغیرہ کہتے ہیں۔
 کیمیا میں یہ واقعہ بہت عام ہے کہ عناصر ایک
 دوسرے کے ساتھ ایک سے زیادہ تناسبوں میں ترکیب
 کھاتے ہیں۔ اور اس طرح اُن سے مختلف مرکب پیدا
 ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں یورپ والوں نے امتیاز
 کے لئے دو رستے اختیار کئے ہیں:-

(۱) ناموں کے ساتھ مختلف طلاستیں اناپ شناپ

لگا دیتے ہیں۔

(ب) اس قسم کے نام رکھتے ہیں جن سے

مرکب کی کیمیائی ترکیب واضح ہو جاتی ہے۔

ہم ان دونوں صورتوں کا تتبع کر سکتے ہیں۔ لیکن

پہلی صورت محض Conventional ہے۔ اس لئے جب
 تک کوئی اشد ضرورت لاحق نہ ہو اُس کے استعمال سے
 پرہیز کرنا چاہئے۔ دوسری صورت کیمیا کے عین حسب
 نشا ہے۔ اور میں اسی کے تتبع کو ترجیح دیتا ہوں۔

مثلاً Phosphorus اور Chlorine کی ترکیب

سے دو مرکب پیدا ہوتے ہیں۔ ایک PCl_3 اور دوسرا

PCl_5 ۔ اس قسم کے مرکبات کو ایک دوسرے سے

تمیز کرنے کے لئے ہم ذیل کی صورتیں اختیار
 کریں گے:-

(۲)

Phosphorous chloride = زہریں سبزید

Phosphoric chloride = زہریں سبزید

(ب)

Phosphorus tri chloride = زہریں تری سبزید

Phosphorus Pentachloride = زہریں پنج سبزید

اسی طرح

Sulphur dioxide = کبریت دو مائیڈ

Sulphur trioxide = کبریت تری مائیڈ (ترائیڈ)

Carbon monoxide = کجلین اکو مائیڈ (یک مائیڈ)

Carbon dioxide = کجلین دو مائیڈ

tetroxide = چو مائیڈ

polyoxide = کثیر مائیڈ (بہائیڈ)

Tri Ferric tetroxide = تلو ہاک چو مائیڈ (تلو ہاک چو مائیڈ)

پہلی صورت میں میں نے س اور ک کو Suffix

کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ دونوں حرف ہندی میں نسبت کی علامتیں ہیں۔ مثلاً چورس۔ بمعنی چار والا۔ چار کو چور اور بہ تخفیف لہ چو بھی کہتے ہیں۔ چو کی مثال چوکور، چوکھی، چوٹرنی وغیرہ موجود ہے۔ ہندی میں ڈھینڈ کے معنی توند کے ہیں۔ یہی لفظ پنجاب میں جا کر ڈھڈا ہو گیا ہے۔ اور پیٹ کے معنی میں عام استعمال ہوتا ہے۔ اس سے اردو میں ڈھینڈس بمعنی توند والا

آتا ہے۔ ک کی مثال میں گندک، رکھشک، (رکھوالی والا) ،
 بھکشک (کھانے والا)، اشک (آٹھ والا) ، موجود ہیں۔ فارسی
 میں بھی یہ حرف ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً
 چوشک (ٹونٹی) پردک (پردہ والا-چستان) ، آتسک (آگ والا
 مرض) کشک (خط)۔ س کی بجائے ج بھی استعمال
 کر سکتے ہیں۔ یہ بھی نسبت کا حرف ہے۔ اور اردو میں
 عام استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً سالہ سے سلج، بھائی سے بھانج،
 آتما سے آنج، نیر سے نیرج، وغیرہ۔ لیکن میں س کو ج
 پر ترجیح دیتا ہوں۔ اور ترجیح کی وجہ ظاہر ہے۔
 یہ ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں س اور ک

کا استعمال محض Conventional ہے۔ اس لئے ان علامتوں
 کو حتی الوسع ترک کیا جائیگا۔ اور دوسری صورت جو کیمیا کے
 لئے زیادہ موزوں ہے عام طور پر وہی استعمال کی جائیگی۔
 میرے مخدوموں کو اس Convention کے وجود سے
 اپنی اختیار کی ہوئی Conventions کی بھرا کے جواز
 پر استدلال نہ کرنا چاہیے۔ یہ وہ Convention ہے جس
 سے میرے مخدوموں کو بھی مفر نہیں۔ اس ایک
 Convention سے بھی ہم حتی الوسع بچتے رہینگے۔ اور
 اس کی بجائے عام طور پر دوسری صورت سے کام
 لینے جو Convention کے میل سے پاک ہے۔

جہاں دو عنصر مختلف تناسبوں میں ترکیب کھا کر

دو سے زیادہ مرکب بنا دیں گے، وہاں ”کم“ اور ”پیر“ کے الفاظ Electro-negative عنصر کے نام کے ساتھ Prefixes کے طور پر استعمال کئے جائیں گے۔ مثلاً

Ferrous Hypoxide = لوہس کم مائیڈ (کمائیڈ)

Ferric Peroxide = لوہک پُر مائیڈ

”لوہس کم مائیڈ“ سے لوہے اور مائین کا وہ مرکب مراد ہوگا جس میں ”لوہس مائیڈ“ کے مقابلہ میں مائین کا تناسب کم ہے۔ اور ”لوہک پُر مائیڈ“ سے وہ مرکب مراد ہوگا جس میں ”لوہک مائیڈ“ کے مقابلہ میں مائین کا تناسب زیادہ ہے۔

گزشتہ تصریح میں جو تسمیہ کی دوسری صورت بتائی گئی ہے اُسے اختیار کر لیا جائے تو یہاں بھی اس اورک کے Conventional استعمال سے بچ سکتے ہیں۔

”کم“ اور ”پیر“ کا استعمال Conventional نہیں۔ یہ دونوں لفظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے اصلیت واقعہ پر دلالت کرتے ہیں۔ چنانچہ ”کم“ کا معاملہ تو بالکل صاف ہے۔ ”پیر“ کا مفہوم البتہ توجیہ طلب ہے۔ اس کا مفہوم سمجھنے کے لئے اُن مرکبات کی ترکیب پر غور فرمائیے جن کے ناموں کے ساتھ

یہ لفظ استعمال ہوگا۔ انگریزی میں ایسے موقعوں پر Prefix

”Per“ استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ Prefix فنِ کیمیا

کی زبان میں اس امر کو تعبیر کرتا ہے کہ جس عنصر (یا Radical) کے نام کے ساتھ اسے استعمال کیا گیا ہے، اُس کی

بڑی سے بڑی مقدار مرکب میں موجود ہے۔ اور بڑی سے بڑی مقدار سے یہ مراد ہے کہ مرکب میں جو دوسرا عنصر موجود ہے اُس کے ساتھ عنصر (یا Radical) مذکور اس سے زیادہ مقدار میں ترکیب نہیں کھا سکتا۔ پھر کیا اس خیال کو ادا کرنے کے لئے ”پُر“ سے کوئی بہتر لفظ مل سکتا ہے جو اس سے زیادہ بے تکلفی کے ساتھ واقعہ مذکورہ کے کیمیائی مفہوم پر دلالت کر سکتا ہو؟

Peroxide کو مثال کے طور پر لے لیجئے۔ اور

اسی خیال کو ”کلیئہ دور عناصر“ کی روشنی میں رکھ کر دیکھئے۔ اس

Highest Typical oxide کے

میں آکسیجن کی جتنی مقدار ہو سکتی ہے، جب اُس سے زیادہ مقدار میں اُس عنصر کے ساتھ آکسیجن ترکیب کھاتی ہے تو

اس سے جو Oxide پیدا ہوتا ہے اُسے Peroxide

کہتے ہیں۔ پھر اس حقیقت کو دیکھ لینے کے بعد کون

کہہ سکتا ہے کہ میں نے جو ”پُر“ کا لفظ اختیار کیا ہے

اُس کے کیمیائی مفہوم میں Arbitrary convention کا

بھی کوئی شاٹہ ہے؟

اس طریق کے رو سے مائین کے مرکباتِ ثنائی

کو ہم ”— مائید“ کہینگے۔ ان میں سے جو پانی کے

ساتھ ترکیب کھا کر ترشہ بنا دیتے ہیں وہ ”ترشئی مائید“

ہونگے۔ اور وہ جو ترشوں کے ساتھ تعامل کر کے نمک

بناتے ہیں انہیں ”اساسی مائید“ کہا جائیگا۔ اگر یہ بات نگاہ میں ہو کہ ٹرشئی مائید حقیقت میں ٹرشہ ہے جس سے پانی کے اجزاء جدا کر لئے گئے ہیں تو اس صورت میں اس کا دوسرا نام ”اپن (ا = نہ + پن = پانی) ٹرشہ“ (Anhydride) ہوگا۔ الف ہندی اور فارسی دونوں میں

لفی کا حرف ہے۔ ہندی میں اکال، امٹ، اٹل، وغیرہ اور فارسی میں اجنبان، ادرست، وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ اساسی مائید اور پانی کی ترکیب سے جو مرکب بنتا ہے اُسے

”جمائید“ (Hydroxide) کہا جائیگا۔ اور OH Radical کو ”جمائی“ کہینگے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ نام بھی اپنے کیمیائی مفہوم پر بخوبی دلالت کرتے ہیں۔ اور ان کے مفہوم کی توضیح کے لئے کسی Arbitrary convention میں پھنسنے کی ضرورت نہیں۔

اس بیان سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ مرکباتِ ثنائی کے تسمیہ میں میری تجویز کہاں تک کام دے سکتی ہے۔ اور کس حد تک فنِ کیمیا کو Conventions کے گورکھ دھندے سے بچا لیتی ہے۔ اب اس کے بعد یہ دیکھنا چاہیے کہ مرکباتِ ثنائی سے آگے بڑھ کر یہ تجویز کہاں تک کامیاب ہوگی۔

ترشوں کے جو معمولی نام کیمیا میں مروج ہیں وہ حقیقت میں علمی نام نہیں۔ اور اب کیمیا میں ان کا وہی

درج ہے جو دوسرے سوقیانہ ناموں کا ہے۔ کیمیادانوں کے پاس بہت سے وجوہ موجود ہیں جن کی بنا پر مان لینا پڑتا ہے کہ ترشے حقیقت میں حمضین کے نمک ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو فن کیمیا کی Ionic Theory سے واقف ہیں وہ اس بات کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ خیال کتنا وزندار ہے۔ پھر اس سے ظاہر ہے کہ ترشوں اور نمکوں کے تسمیہ میں کسی قسم کی وجہ امتیاز تلاش کرنا محض لاحاصل ہے۔ اس بناء پر فن کیمیا میں Hydrogen Sulphate کا لفظ Sulphuric acid کے لفظ سے زیادہ موزوں اور زیادہ معنی خیز ہے۔ اس لئے میں اسی کو ترجیح کی نگاہ سے دیکھوں گا۔ اور ترشوں اور نمکوں کے تسمیہ کے لئے ایک ہی طریقہ اختیار کروں گا۔

میری تجویز میں Radicals کے نام تسمیہ کے موقوف علیہ ہیں۔ اور Radicals کے ناموں میں Radicals کی کیمیائی ترکیب کا التزام ہے۔ اس خیال کے رو سے Sulphuric acid ، دو Radicals سے مرکب ہے جن میں ہائیڈروجن، اسامی Radical ہے۔ اور SO₂ ترشی Radical - ان دونوں کے نام رکھ لئے جائیں تو پھر دونوں ناموں کو ملا لینے سے Sulphuric acid کے لئے ایک ایسا نام تیار ہو جائیگا جو اس مرکب کی کیمیائی ترکیب پر دلالت کریگا۔ اور یہی کیمیائی تسمیہ کی اصلی غایت ہے۔ اس مطلب کے لئے ہم Radical

SO_4 کو ماکبریدہ کہہ سکتے ہیں۔ اس صورت میں Sulphuric acid کا نام ہماری زبان میں حمضین ماکبریدہ ہوگا۔ اس نام میں ماکبریدن کا وجود مان کر اشتقاق کیا گیا ہے۔

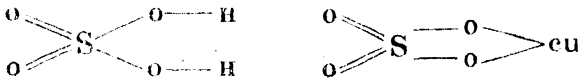
اب ملاحظہ فرمائیے کہ یہ نام فنِ کیمیا کی ضروریات کو کس حد تک پورا کر سکتا ہے۔ جو صاحب کیمیائی تفسیرات کی اصلیت سے واقف ہیں وہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ نام بلا تکلف، کیمیائی تغیر کا پتہ دیتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ جن عناصر کا نام لیا گیا ہے ان کا ملاپ، طبعی ملاپ نہیں۔ بلکہ ایسا ملاپ ہے جو طبعی ملاپ کی حد سے آگے گزرا ہوا ہے۔ یعنی اس نام میں اس بات پر دلالت کرنے کی قابلیت موجود ہے کہ اس کے سسلی کا وجود کسی کیمیائی تغیر کا نتیجہ ہے۔ پھر ماکبریدہ کی لفظی ترکیب پر غور فرمائیے۔ ماکبریدن سے اس کا اشتقاق صاف بتا دیتا ہے کہ ماہین اور کبریت کی ترکیب معمولی ترکیب نہیں بلکہ ایسی ترکیب ہے کہ ان اجزاء کے ملنے سے جو چیز حاصل ہوئی ہے وہ ایک

مستقل Radical بن گئی ہے۔ علاوہ بریں حمضین ماکبریدہ کے نام سے اس بات کا بھی پتہ چل جاتا ہے کہ جس مرکب کا یہ نام رکھا گیا ہے اس کی ترکیب میں حمضین، ماہین، اور کبریت کے سوا اور کسی چیز کا دخل نہیں۔

یعنی نام خود بخود اپنے مسسئی کی کیمیائی ترکیب پر دلالت کرتا ہے۔
 صرف ایک بات باقی رہ جاتی ہے۔ یعنی نام سے اس بات
 کا پتہ نہیں چلتا کہ مرکب کی ترکیب میں اُس کے اجزائے
 ترکیبی کا تناسب کیا ہے۔ سو یہ کچھ ہرج کی بات نہیں۔

Graphic Formula کے Copper Sulphate اور H_2SO_4

پر غور فرمائیے تو اس نام کی کیمیائی خوبی زیادہ واضح ہو جائیگی۔
 یہ شکل بھی آپ کے ملاحظہ کے لئے ذیل میں درج کر دیتا
 ہوں:—



یہ مثال میرے مطلب کی وضاحت کے لئے
 کافی ہوگی۔ اب ترشوں اور نمکوں کے تسمیہ کی تفصیل عرض
 کرتا ہوں۔ انگریزی میں جن ترشوں کے ناموں کے ساتھ
 —Io آتا ہے وہ اُن Oxides سے بنتے ہیں۔
 جن کو تعبیر کرنے کے لئے میں نے ک کو حرف نسبت
 کے طور پر اختیار کیا ہے۔ ان ترشوں کے نام رکھنے کا
 طریق وہی ہوگا جس کی مثال اوپر عرض کر چکا ہوں۔ اور
 وہ ترشے جن کے انگریزی ناموں میں امتیازی علامت
 —Ous ہے، اُن کے ناموں کے لئے مصدر کی شکل کو
 ذرا بدل دیا جائیگا۔ مثلاً SO_4 Radical کو تعبیر کرنے کے لئے

ماکبریدہ اختیار کیا گیا ہے۔ تو $S O_3$ Radical کو تعبیر کرنے کے لئے اسی لفظ کو ماکبرودہ کر دیا جائیگا۔ اس بنا پر $Sulphurous acid$ یعنی $Hydrogen Sulphite$ کا نام حمضین ماکبرودہ ہوگا۔

مجھے افسوس ہے کہ اس مقام پر پہنچ کر ایک اناپ شناپ Convention سے سابقہ پڑ گیا ہے۔ اور یہاں اس کے بغیر چارہ نہیں۔ یعنی اس بات کو فرض کر لینا پڑیگا کہ ہم ماکبرودہ کہینگے تو اس سے $S O_3$ Radical مراد ہوگا۔ اور جب ماکبریدہ کہینگے تو اس سے $S O_4$ Radical سمجھا جائیگا۔ اس میں شک نہیں کہ س اور ک کے استعمال سے یہ Convention کسی قدر ہلکا ہو سکتا ہے لیکن اس صورت میں دقت یہ ہے کہ ذرا سے ہلکا پن کی خاطر، تسمیہ کی بنا Radicals کے تسمیہ پر رکتے کو نہایت موزون اصول ہاتھ سے جاتا رہیگا۔ اس لئے اس Convention کو گوارا کر لینا چاہیے۔ اور اس فائدہ کو نگاہ میں رکھنا چاہیے کہ اس طریقہ نے کئی Conventions کے بوجھ سے بچا لیا ہے۔ میرے مخدوموں کو چاہیے کہ میری تجویز کی اس ذرا سی کمزوری کو اعتراض کے لئے بہانہ نہ بنالیں۔ بلکہ اس موقع پر میری مدد فرمائیں اور کوئی ایسی صورت پیدا کریں کہ اتنا سا Convention بھی باقی نہ رہے۔ اس ذرا سے Convention کو سامنے رکھ کر بے شمار

Conventions کے جواز کے لئے رستہ بنا لینا ٹھیک نہیں۔

جب ترخشی Radicals کے ناموں کا فیصلہ ہو گیا تو

ترشوں کے لئے ہم ذیل کے نام بھی رکھ سکتے ہیں :-

Salphurous Acid	ماکبرودہ ترشہ
Sulphuric Acid	ماکبریدہ ترشہ
Nitrous Acid	ماثر جودہ ترشہ
Nitric Acid	ماثر جیدہ ترشہ

اس مقام پر آکر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ میرے تجویز کئے ہوئے اصولِ تسمیہ کے رُو سے ترشوں کے ان ناموں میں حمضین کی موجودگی کا بھی اشارہ ہونا چاہیے۔ اور وہ یہاں موجود نہیں۔ لیکن اگر آپ تعمق نظر درلغ نہ فرمائینگے تو ذرا سے غور کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ جائینگے کہ یہ سوال اہل فن کی نگاہ میں کوئی وقت نہیں رکھتا۔ واقعہ یہ ہے کہ حمضین ہی مرکبات کے ترخشی خواص کی اصل ہے۔ اس لئے کسی مرکب کو مثرشہ کہنا ہی گویا اس بات کا اقرار کر لینا ہے کہ مرکب کی ترکیب میں حمضین موجود ہے۔

مثرشے دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جن کی ترکیب میں مائین داخل ہے۔ اور دوسرے وہ جن کی ترکیب میں مائین داخل نہیں پہلی قسم کے ترشے کو مثرشہ (Oxyacid) اور دوسری قسم کے ترشے کو حمثرشہ (Hydracid) کہا جائیگا۔ تا اور ہم وغیرہ کے اختصار پر اعتراض نہ فرمائیں۔ یہ بھی آپ کے فصحا کا متبع ہے۔ اور ضرورت کی پیدا کی ہوئی مجبوری

سے کیا گیا ہے۔ جب آپ کی زبان میں فارغِ خطی سے فارغِ خطی ہو گیا۔ فصیحیت سے فصیحی ہو کر فصیحی بن گیا۔ اور نظامی نے اصطرلاب سے صُلاب بنا لیا۔ اور محض ضرورتِ شعری کے لئے بنا لیا، تو میں فنِ کیمیا کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اس حق سے کیوں فائدہ نہ اٹھاؤں :-

ہمزتج و صُلاب برداشتند

برآں کار یک ہفتہ نگزاشتند

اور تمیز، تغیر، نیت، محویت، خاصیت، کیفیت، کی ایک ایک "سی" اور مواسات، محاکات، محابات، مدارات، 'مفاجات' وغیرہ کی "ت" جس طرح بے ڈکار ہضم ہو جاتی ہے اُس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ پھر ظہوری کی چیرہ دستی ملاحظہ فرمائیے۔ مصنون کا پیٹ پھاڑ کر ہمزہ اس طرح نکال لیا ہے کہ گویا کوئی دیکھتا ہی نہیں :-

خدا پیرایہ بخشہ از قبولش

مصوں دارد زرد ہر فضولش

عرب، الفاظ کے اختصار سے گزر کر پورے جملوں کے اختصار پر پہنچ گئے ہیں۔ ہَلَلْ، بَسْمَلْ، اَلِش (اَسْ شِئْ) فِش (فِ شِئْ) وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ پھر میں نے جو کچھ کیا ہے اُس میں تو صرف و نحو کے قواعد کی بھی خلاف ورزی نہیں۔

یہ اسی قاعدہ کا نتیجہ ہے جسے آپ ترحیم کہتے ہیں اور اُس کا
سہارا لے کر مانند سے مان بنا لیتے ہیں۔

ماترثوں کے ناموں کے ساتھ کم اور پُر کے الفاظ
بھی استعمال ہونگے۔ ان دونوں لفظوں کے مفہوم کی اس سے
پہلے تشریح کر چکا ہوں۔ اور یہ بھی بتا چکا ہوں کہ ان دونوں
لفظوں کا کیمیائی مفہوم انپ شناپ Conventions کے
میل سے پاک ہے۔ اب ذیل میں مٹرثوں کے نام ترتیب وار
درج کرتا ہوں۔ یہ ترتیب، مانین کی مقدار کے اعتبار پر ہے۔
دیکھ لیجے مانین کی مقداروں کے فرق کو تعبیر کرنے کے لئے
جو الفاظ اختیار کئے گئے ہیں، وہ کس حد تک اس واقعہ
پر دلالت کرتے ہیں۔ صرف دو نام ایسے ہیں جن کے ساتھ
Convention کا بوجھ ہے۔ اور اس کی طرف میں پہلے اشارہ
کر چکا ہوں۔ اس Convention کے بعد باقی ناموں کے لئے
خود بخود رستہ صاف ہو گیا ہے۔

Hypo Sulphurous Acid	=	کم ماکبرودہ مٹرثہ
Sulphurous Acid	=	ماکبرودہ مٹرثہ
Sulphuric Acid	=	ماکبریدہ مٹرثہ
Per Sulphuric Acid	=	پُر ماکبریدہ مٹرثہ

بعض Sulphides بھی مٹرثے بنا دیتے ہیں ترکیب
کے اعتبار سے یہ مٹرثے ماترثوں کے مشابہ ہوتے ہیں۔ صرف

اتنا فرق ہے کہ ان میں اترشوں کی مائین کے بعض یا سُل جوہروں کی جگہ گنڈک کے جوہروں نے لے لی ہوتی ہے۔ اس قسم کے ترشہ میں جب تک مائین کا نشان باقی رہیگا، اُسے ہم گنڈا ترشہ کہیں گے۔ اور جب گنڈک اُس میں سے تمام مائین کو نکال دیگی اور خود اُس کی جگہ لے لیگی تو اس کا نام گنڈا ترشہ ہوگا۔ اس نام میں بھی فنِ کیسا کے تمام لوازمات موجود ہیں اور Arbitrary Convention کے غیر ضروری میل نے اسے چھوٹا تک نہیں۔

جب کسی ایک اپن ترشہ (Anhydride) سے کسی ترشوں کا اشتقاق ہوتا ہے تو اُن کا تعلق دکھانے کے لئے بہترین تدبیر یہ ہے کہ Fully hydroxylated type سے ابتدا کی جائے۔ اور یہ دکھایا جائے کہ اس سے پانی کے خارج ہو جانے سے دوسرے ترشے کس طرح بنتے جاتے ہیں۔ اس بات کی ضرورت نہیں کہ Type مذکور جس ترشہ کو تعبیر کرتا ہے اُس کا وجود خارج میں بھی موجود ہو۔ اگر اس کا اپن ترشہ (Anhydride) موجود ہے تو وہی کافی ہے۔ اس Type کے ترشہ کو یورپ والے Ortho acid کہتے ہیں۔ ہم Ortho کی جگہ مطلق کا لفظ استعمال کریں گے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ لفظ جس واقعہ کو تعبیر کرنے کے لئے تجویز کیا گیا ہے اُس کی کیمیائی اہمیت پر بلا تکلف دلالت کرتا ہے۔

Ortho phosphoric acid = مطلق ماڑہریدہ ترشہ
یا بقاعدہ ترخیم، مطلق ماڑہریدہ ترشہ

پھر اس سے پانی کے اجزا خارج کرتے جاٹینگے
تو اس سے جو ترشے پیدا ہونگے اُن کے نام حسب ذیل
ہو جائینگے :-

First Meta Phosphoric acid = پہلا درا ماڑہریدہ ترشہ

Second Meta Phosphoric acid = دوسرا درا ماڑہریدہ ترشہ

وغیرہ
وغیرہ
اس نام میں "درا" کے لفظ کا اضافہ کیا گیا ہے۔
اور یہ لفظ اپنا کیمیائی مفہوم صاف بتاتا ہے۔ اس کے مفہوم میں
جتنا Convention ہے وہ لفظی Convention نہیں بلکہ خالص فن
کا Convention ہے اور اس قسم کے Conventions سے کوئی
فن پاک نہیں۔

کبھی مطلق ماڑہریدہ یا اُس سے پیدا شدہ کسی دوسرے
ترشہ کی "نابیدگی" (dehydration) اس طرح ہوتی ہے کہ اُس کے
دو یا دو سے زیادہ سالموں کے وجود سے پانی کا اخراج ہوتا ہے اور ان
سالموں کے مابقا آپس میں ترکیب کھا کر ایک نئے Type
کا ترشہ بنا دیتے ہیں۔ اس قسم کے ترشہ کو یورپ والے
Pyro acid کہتے ہیں۔ Pyro کے معنی آگ کے ہیں۔

اور Pyro Acid کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مطلق ماڑہریدہ وغیرہ
کی "نابیدگی" کے لئے آگ سے کام لینا پڑتا ہے۔ ہم

Pyro کی جگہ ژند کا لفظ "آتر" استعمال کر سکتے ہیں۔ ژند میں آتش کی شکل آترش ہے۔ اور آترش اکثر بہ تخفیف ش آتر ہو جاتا ہے۔ اسی کی بگڑی ہوئی شکل "آذ" ہے۔ آتر کی بجائے "تش" کا لفظ بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ فارسی میں تش بمعنی آتش آتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں آتر قابل ترجیح ہے۔ اس کے استعمال سے لفظ کی ایک مستقل اور جداگانہ شکل قائم ہو جائیگی۔ اس بنا پر

Pyro Phosphoric acid = آترمازہریدہ ترشہ
یا تشمازہریدہ ترشہ

اس نام میں لفظ "آتر" یا "تش" کا استعمال بظاہر Conventional نظر آتا ہے۔ لیکن اس بات کو نگاہ میں رکھنا چاہیے کہ یہ لفظ ایک امر واقعہ کو تعبیر کرتا ہے۔ اور جب امر واقعہ کو تعبیر کرتا ہے تو پھر اُسے محض Conventional کیونکر کہہ سکتے ہیں؟

تسمیہ کے لئے جب ہم نے یہ اصول اختیار کر لیا کہ اُس کی بنا Radicals کے تسمیہ پر رکھی جائیگی اور یہ بھی مان لیا کہ فنِ کیمیا میں نکلوں اور ترشوں کی اصلیت ایک ہے۔ تو اس کے بعد نکلوں کا تسمیہ کچھ مشکل نہیں۔ چنانچہ ترشٹی Radicals کے نام تجویز ہو چکے ہیں۔ اب اُن کے ساتھ صرف اِساسی Radicals کا نام ملا دینا ہوگا۔

Natrium Hypo Sulphite = نظرونیہ کم ماکبرودہ

Natrium Sulphite

نظرونیہ ماکبریدہ

Natrium Sulphate-

نظرونیہ ماکبریدہ

Natrium Per sulphate

نظرونیہ پُرماکبریدہ

وغیرہ

وغیرہ

جہاں ایک دھات کسی تڑشے کے ساتھ دونک

بناتی ہے وہاں س اورک کو Suffix کے طور پر استعمال کیا جائیگا۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں خاص طور پر ان علامتوں کی ضرورت پڑیگی۔ مثلاً

Ferrous sulphate = لوہس ماکبریدہ

Ferric sulphate = لوہک ماکبریدہ

حجم تڑشے (Hydracids) مرکباتِ ثنائی میں داخل

ہیں۔ اس لئے ان کے نمک بھی ثنائی مرکب ہیں۔ ان کے تسمیہ کا طریق موصی ہونا چاہیے جو مرکباتِ ثنائی کے باب میں بیان ہو چکا ہے۔

مرقح نام مثلاً تو تیا، نیلا تھو تھیا، سبز کاہی، ہیرا کیس،

سیندور، شنگرف وغیرہ بھی نظر انداز نہ ہونگے۔

مجھے انوس ہے کہ پورا تسمیہ آپ کی خدمت میں پیش نہیں کر سکا۔ پورا تسمیہ آپ کی نگاہ کے سامنے آجاتا تو جو اصول میں نے اختیار کیا ہے اُس کی خوبی زیادہ واضح ہو جاتی۔ تاہم جتنے کی مجھے سر دست ضرورت ہے، اتنا تیار ہو گیا ہے۔ اور منزلِ مقصود کا رستہ دکھا دینے کے لئے یہی

کافی ہے۔ اب باقی چیزوں کے نام رکھ لینا کچھ مشکل نہیں۔
 Radical کے لئے اُس کی کیمیائی ترکیب کی رعایت
 رکھ کر نام وضع کر لیجے۔ پھر ان ناموں کو جوڑ جوڑ کر مرکبات
 کے نام رکھتے جائیے۔ یہ نام اپنے مولوں کی کیمیائی ترکیب
 پر بلا تکلف دلالت کریں گے جس سے فنِ کیمیا کی ایک بہت
 بڑی مشکل حل ہو جائیگی اور فنِ آپ کے قابو میں آجائے گا۔
 جس طرح کسی فن کی خصوصیات معلوم کرنا ہو تو جب
 تک اُس فن کے اندر داخل نہ ہو جائیں اس مطلب کا حاصل
 ہونا ممکن نہیں۔ اُسی طرح کسی فن کی زبان سمجھنے کے لئے
 اور زبان کی خصوصیات معلوم کرنے کے لئے بھی فن کے
 اندر داخل ہونے کی ضرورت ہے۔ اس لئے میری التجا
 یہ ہے کہ کیمیائی تسمیہ کا آخری فیصلہ کر لینے سے پہلے فن
 کی ضروریات کو فن کی نگاہ سے ملاحظہ فرمائیے۔ ورنہ
 آپ کا اختیار کیا ہوا رستہ کامیابی کے رستے سے یقیناً دُور
 جا پڑے گا۔

آخر میں اس بات کے لئے معافی کا خواستگار ہوں
 کہ اس مضمون میں میں نے بعض باتوں کو جو بظاہر غیر متعلق
 معلوم ہوتی ہیں زیادہ پھیلا دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ جو کچھ کیا
 گیا ہے مشکلات کی جمبوری سے کیا گیا ہے۔ باقی دنیا
 میں علوم و فنون کی ترویج و حفاظت کے متعلق یہ شد و مد
 اور وارفتگی نہ ہوگی جس شد و مد اور وارفتگی کے ساتھ میرے

سامنے اُردو کے نکسالی محاوروں، نکسالی الفاظ، اور الفاظ کے نکسالی مفہوموں کی پرستش کی بحث چھڑ گئی ہے۔ پھر اس طوفان میں صرف نفسِ مطلب ہی پر نگاہ رکھوں تو میرے بچاؤ کی کیا امید ہو سکتی ہے؟ تفصیل سے کام نہ لیتا تو مضمون ادھورا رہ جاتا۔ اور میرے مخدوم مصنوعی اور بے صول فصاحت کے فتووں سے میری آزادی کی تمام راہیں بند کر دیتے۔ ہمارے ملک میں اصحابِ رائے کے تین گروہ ہیں۔ اور مجھے ان تینوں گروہوں کی تسلی کرنا ہے۔

ایک گروہ کی شریعت میں، نئی اصطلاحات اور اصطلاحات کے لئے نئی ترکیبیں وضع کرتا، اور موجودہ الفاظ کا جو آج کل مفہوم ہے اُس سے ادھر ادھر ہٹ جانا، یا ان الفاظ کے کسی ایسے مفہوم کو جو فی الحال ہماری نگاہ سے ہٹا ہوا ہے جگالینا، قطعاً حرام ہے۔ اس گروہ کے ارکان اتنی ہی اُردو کو اُردو زبان سمجھتے ہیں جتنی شعرائے اُردو کے دیوانوں میں آگئی ہے۔ اور جو کچھ ان دیوانوں کے باہر ہے اُس کا اُن کی نگاہ میں کوئی وجود نہیں اور اگر ہے تو وہ سب کچھ "اُردو فصاحت" کی لن ترانیوں کے سامنے مطرود اور مردود ہے۔ پھر طرفہ یہ کہ اس گروہ کے ارکان زبان کے مسائل میں قواعد اور اصول کے قائل نہیں۔ حرف حرف اور نقطہ نقطہ کو سماح پر منحصر سمجھتے ہیں۔ اس بواجبی کا نتیجہ یہ ہے کہ مجھ سے طبیعیات اور کیمیا کے مطالب کو

زلف و گیسو، گل و بلبل، سرو و قمری، ترگس و سوسن، جعد و سنبل،
لب و رخسار، غنچ و دلال، ہجر و وصال، شکلیتِ فلک، شکوہِ بخت،
ابر و باران، مے و مطرب، جام و ساقی، وغیرہ کی زبان میں ادا کرنے
کی تمنا کی جاتی ہے۔ اس شریعت کا گویا یہ فتویٰ ہے کہ مطالبِ علمی
اور نیکاتِ حکمی کو بیان کرنے کے لئے تخیل میں کسی قسم کی جبر
پیدا کرنے کی ضرورت پیش آجائے اور ہمارے شعرا کا ٹکسالی
مجاورہ یا ہندوستان کے بعض شہروں کی ”دال چپاتی“ اور ”توے پرت“
کی زبان اس ضرورت کو پورا کرنے سے عاجز ہو جائے تو ضرورت
کو ترک کر دو اور رواج کے پرستار بن جاؤ۔ مجھے خوب
معلوم ہے کہ ان دعووں کی پشت پر فصاحت کا زور ہے۔
اور مجاورہ کا التزام فصاحت کا جزو لاینفک ہے۔ لیکن اس
کے ساتھ ہی میں فصاحت کی غرض و غایت کو بھی بھولنا نہیں
چاہتا۔ صانعِ قدرت نے جب انسانی تخیل کو وسعت کے اعتبار
سے ایک میدان بنے پایا بنا دیا ہے تو کیا اس بات کی ضرورت
نہیں کہ تخیل کا ساتھ دینے کے لئے فصاحت کے اصولوں
میں بھی وسعت کی گنجائش ہو؟ فصاحت کے التزام کا اصلی
مقصد یہ ہے کہ متکلم کی زبان سے جو کچھ نکلے سامع کے
ذہن میں بالنتیجہ اس کا وہی مفہوم قائم ہو جائے جو متکلم
کے ذہن میں ہے۔ اب اگر آپ کوئی اس قسم کا مضمون
بیان کرنا چاہیں جس میں آپ کے مقرر کئے ہوئے اصولِ فصاحت
کام نہ دے سکتے ہوں اور ان کے التزام سے متکلم

اور سامع کے درمیان تاریکی کے پردے کھڑے ہوتے جائیں تو کیا اس فصاحت کو فصاحت کہنا جائز ہوگا؟ کیا ایسی صورتوں میں آپ اپنی فصاحت کو مورد الزام قرار دینگے یا مضمون ہی کو ترک کر دینگے؟

یہ مسلم ہے کہ ابتدا میں ہر لفظ ایک ہی معنی کے لئے وضع ہوتا ہے۔ پھر انسان جوں جوں تمدن کے مدارج طے کرتا جاتا ہے اور اُس کے تخیل میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے، الفاظ کا مفہوم بھی پھیلتا جاتا ہے۔ اہل زبان کو جب کوئی ایسا خیال ادا کرنا پڑتا ہے جس کے لئے زبان میں پہلے سے کوئی لفظ معین نہیں تو وہ اُن خیالات پر نگاہ ڈالتے ہیں جو اس نئے خیال کے ساتھ بہت قریب کا تعلق رکھتے ہیں۔ اور اِن خیالات کو ادا کرنے کے لئے جو الفاظ معین ہو چکے ہیں اُن میں سے کسی مناسب لفظ کو لے کر اپنا نیا خیال ادا کر لیتے ہیں۔ اس طرح ایک ایک لفظ رفتہ رفتہ کئی مفہوموں کا مالک بن جاتا ہے۔ اور اکثر الفاظ کی تو یہ حالت ہو جاتی ہے کہ اُن کے ابتدائی اور انتہائی مفہوموں میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ میں وہ الفاظ بھی بتا سکتا ہوں جو ابتدا میں کسی خاص مفہوم کو ادا کرنے کے لئے وضع کئے گئے تھے۔ پھر انسانی تخیل کے انقلابات نے اُن کے مفہوم کو آخر اس درجہ پر پہنچا دیا کہ اُسے ابتدائی مفہوم کے ساتھ بظاہر کوئی مناسبت

ہی نہ رہی۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ ہر لفظ کو ازل سے ابتدا تک اسی مفہوم پر قائم رکھنا چاہیے جو زبان کی ابتدائے آفرینش میں اُس کو پہنا دیا گیا تھا تو دنیا میں وہ کون ہے جس کی یہ تمنا پوری ہو سکتی ہے! اور کونسی زبان ہے جو اس ناممکن التزام پر قائم رہ سکتی ہے! زبانیں ہمیشہ تخیل کی تابع ہوا کرتی ہیں۔ تخیل میں انقلاب پیدا ہوتا ہے تو اُس کے ساتھ ہی زبانوں میں بھی انقلاب آجاتا ہے اور اس قسم کے فطری انقلابوں کو کوئی روک نہیں سکتا۔

وہ اصحاب جو اس قسم کے التزاموں کے دل دادہ ہیں انہیں اپنی ضد پر قائم رہنے کا تہیہ کر لینے سے پہلے تو ایجنج السنہ پر بھی نگاہ ڈال لینی چاہیے۔ اس مطلب کے لئے اسلامی توہیت کی جان یعنی عربی زبان اور ہندوستان کی مردہ زبان سنسکرت کے انقلابات کا مطالعہ زیادہ موزون ہوگا۔ ان زبانوں کے ساتھ ہمارے نہایت قریب کے تعلقات ہیں۔ اس لئے ان کے انقلابات کو ہم زیادہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ آریہ قوم اپنے قدیم وطن کو چھوڑ کر جب ہندوستان میں آگئی تو کیا یہ ممکن تھا کہ ہندوستان میں آکر نئے پیدا ہونے والے خیالات کو ادا کرنے کے لئے وہی ٹکسالی محاورے، وہی ٹکسالی الفاظ، اور الفاظ کے وہی ٹکسالی مفہوم کفایت کرتے جو ہندو کش کی گھاٹیوں میں اور جیون و سیمون کے کناروں پر پیدا ہونے والے خیالات کو ادا کرنے کے لئے کفایت کرتے تھے؟ پھر ایک مدت کے اندرونی انقلابات کے بعد جب ہندوستان کے

میدانوں میں اسلامی سیلاب آیا تو ہندوستان کی پُرانی زبان نے اس نئے تخیل کا جس حد تک ساتھ دیا آج اُس کا حرف حرف آپ کی نگاہ کے سامنے ہے۔ پھر اپنے ذاتی کارناموں کو بھی دیکھ لیجے۔ آپ کے آبا و اجداد ہندوستان میں کونسی زبان لے کر داخل ہوئے اور آج آپ کونسی زبان بول رہے ہیں!! کیا انہیں اپنی زبان اور زبان کی فصاحت کا خیال نہ تھا؟ اور کیا وہ آپ کو وہی بولیاں نہ سکھاتے تھے جو خود بولا کرتے تھے؟ عرب میں ایک وہ زبان تھی جس کی صدائیں عکاظ کے میدان میں گونجا کرتی تھیں۔ اور ایک وہ زبان ہے جس کی فصاحت کے پشے فاران کی وادیوں اور یشرب کے میدانوں سے اُبلے اور اُن کے پیدا کئے ہوئے سیلاب نے ایک عالم کو سیراب کر دیا۔ پھر ایک وہ زبان ہے جس میں حکمائے اسلام نے الہیات کے مطالب اور حکمت کے نکات بیان کئے۔ غور فرمائیے عرب کا ایک تخیل وہ تھا جس کی تصویر عرب کے فصحا عکاظ کے میدان میں کھینچا کرتے تھے۔ اور ایک تخیل وہ ہے جو اسلام نے پیدا کر دیا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ عرب کے وہ عکسالی محاورے، وہ عکسالی الفاظ، اور الفاظ کے وہ عکسالی مفہوم جو زمانہ جاہلیت میں عکاظ کے میدان میں گونجا کرتے تھے اُن ہی سے کام لے کر قرآن کے مطالب اور علم و حکمت کے نکات بیان کر لئے جاتے۔ علم و حکمت کے اعتبار سے آج

آپ کے سامنے بھی اس قسم کا تخیل ہے جس سے آپ کی زبان آشنا نہیں۔ اور آپ کی زبان کے ٹکسالی محاورے، ٹکسالی الفاظ، اور الفاظ کے ٹکسالی مفہوم جن بولیوں کے لئے مخصوص ہیں وہ بولیاں بھی آپ کی نگاہ میں ہیں۔ پھر خود انصاف فرمائیے کہ یہ بولیاں بول کر میں علم و حکمت کے مسائل کس طرح بیان کروں!! لامحالہ آپ کی اُردو کو بھی علم و حکمت کے سامنے اسی طرح جھک جانا پڑیگا جس طرح دُنیا کی دوسری زبانیں جھک جایا کرتی ہیں۔ اور اگر آپ اپنی زبان کے اُن ہی ٹکسالی محاوروں، ٹکسالی الفاظ اور الفاظ کے ٹکسالی مفہوموں کو قائم رکھنا چاہتے ہیں جو علم و حکمت کے مطالب بیان کرنے سے عاجز ہیں تو میرے مخدومو! پھر آپ کی زبان حیوانِ ناطق کی زبان نہیں بلکہ محض چرندوں اور پرندوں کی زبان ہے جو ہمیشہ اور ہر حال میں وہی بولیاں بولتے آئے ہیں اور بولتے رہینگے جو ابتدائے آفرینش میں انہیں سکھا دی گئی تھیں۔

دوسرا گروہ پہلے گروہ کی پیدا کی ہوئی بندشوں کا تو پابند نہیں۔ لیکن ظاہر کی آرائش کو فن کی ضروریات پر بہر نوع مقدم سمجھتا ہے۔ اور عالمانہ اصطلاحات میں اس حد تک عالمیتاً "ہلکاپن" تلاش کرنا چاہتا ہے کہ علمی ضروریات کو عوام کے فہم و ادراک پر قربان کر دیتا ہے۔ پھر اس سے آگے بڑھتا ہے۔ تو جہاں اس قسم کے دو لفظ نگاہ کے سامنے آجاتے ہیں

جن میں ایک، فن کے مطالب بیان کرنے کے لئے زیادہ
 موزون نظر آتا ہے اور دوسرے میں شاعرانہ انداز زیادہ نمایاں
 ہوتا ہے، وہاں پہلے کو رد کر دیتا ہے اور دوسرے کو ترجیح
 کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ خیال حقیقت میں ایک پُرانی بحث
 کا شاخسانہ ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ الفاظ کے رنگ روپ
 اور حسن و خوبی کو ترجیح کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے یا مضمون
 کی عمدگی اور جدت و ندرت کو؟ یہ بحث شاعری کے متعلق پیدا
 ہوئی اور اہل الرائے کے گروہ نے زیادہ تر الفاظ ہی کو
 ترجیح کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ
 اس بحث کا دائرہ شاعری تک محدود کر دیا جائے تو یہ
 بحث ایک حد تک بے ضرر متصور ہو سکتی ہے۔ لیکن اس
 بحث کو اگر یہاں تک وسعت دے دی جائے کہ تمام
 علوم و فنون اسی کی پیٹ میں آجائیں تو پتھر کیا یہ ممکن
 ہے کہ علوم و فنون کے لئے ترقی کی گنجائش باقی رہے؟
 وہ علوم جو آج ہمارے پیش نظر ہیں اور جنہیں ہم اُردو زبان
 میں منتقل کرنا چاہتے ہیں اول تو اُن کے مطالب ہی اس
 قسم کے ہیں کہ اُردو زبان، اور اُردو بولنے والوں کا تخیل بحکم
 عموم، اُن سے آشنا نہیں اور دوسری مشکل یہ ہے کہ اُن
 کا انداز اس قسم کا ہے کہ ترقی کی راہیں خود بخود پیدا ہوتی
 جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ روز بروز نئے نئے مضامین اور
 نئے نئے خیالات پیدا ہو رہے ہیں۔ جب واقعات کی یہ صورت

ہو تو کیا یہ ممکن ہے کہ جو لوگ اُردو کو علم و حکمت کا مخزن بنا دینا چاہتے ہیں وہ ہماری بے فکری کے زمانہ کی پیدا کی ہوئی خوش وقتیوں کے پرستار بن کر منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں؟ تیسرے گروہ میں وہ اہل فن ہیں جن کے کام و دماغ زبان کی لذت سے بھی آشنا ہیں۔ ان کے ساتھ وہ ارباب بصیرت بھی ہیں جو طبیعیات اور کیمیا وغیرہ سے تو واقف نہیں لیکن اُن کے دل و دماغ علوم و فنون کی مشکلات سے ضرور واقف ہیں۔ انہوں نے کہ اس قسم کے اہل فن اور ارباب بصیرت آج ہندوستان میں صرف خال خال ہیں۔ اس لئے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ سر دست اس گروہ کی رائے کو غلبہ نصیب ہو۔ تاہم اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ آخر کار میدانِ اسی گروہ کے ہاتھ رہے گا۔ اس گروہ کا فرض ہے کہ زبان کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کی ضروریات کا بھی خیال رکھے اور فن کی ضروریات کو باقی تمام چیزوں پر مقدم سمجھے۔ پھر جہاں یہ موقع آجائے کہ کسی خارجی التزام کی پابندی سے نفسِ فن کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو، وہاں ضروریاتِ فن کو ترجیح کی نگاہ سے دیکھے اور نفسِ مضمون کے مقابلہ میں خارجی التزاموں کو ترک کر دے۔ آج اس فراخ دلی اور بلند نگہی سے کام نہ لیا جائے گا تو کل خود بخود یہ حال ہو جائے گا کہ زمانہ کی پیدا کی ہوئی مجبوریاں ہمیں جبراً اس راہ پر لے آئیں گی یا ہمیں اس بات پر مجبور کر دیں گی کہ ان بلند ارادوں

کو جو آگے چل کر ہماری قومی اور ملکی زندگی کے لئے مائے حیات بننے والے ہیں ترک کر دیا جائے۔

اس مضمون کے متعلق جو کچھ میرے فہم ناقص میں آیا ہے وہ آپ کے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں جہاں تک ممکن تھا ضروریاتِ فن کے ساتھ ساتھ زبان کے اصول و قواعد کا بھی پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اب بلاغتِ فن کے نکتہ شناس اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ میری تجویزیں یکمیا کے لئے کہاں تک موزوں ہیں اور ان سے کامیابی کی راہیں کہاں تک روشن ہو جائیں گی۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

برکت علی

ذیل میں ان چند عناصر کے انگریزی نام درج ہیں جن کا اس رسالہ میں ذکر آیا ہے۔ ان کے سامنے وہ نام بھی لکھ دئے ہیں جو اردو میں ان کے لئے اختیار کئے گئے ہیں۔ اس سے ناظرین کے لئے مطالب کے سمجھنے میں سہولت ہو جائیگی۔

Carbon

کربلین

Chlorine

سبزین

Copper

تانبا

Hydrogen

تھن

Iodine

بنفشین

Iron

لوا

Magnesium

مغنیشیم

Nitrogen

نٹروجن

Oxygen

مائن

Phosphorus

نہرین

Potassium

قلویہ

Sodium

نٹرونیہ

Sulphur

گندک - کبریت

